صدیق الرحمٰن قدوائی

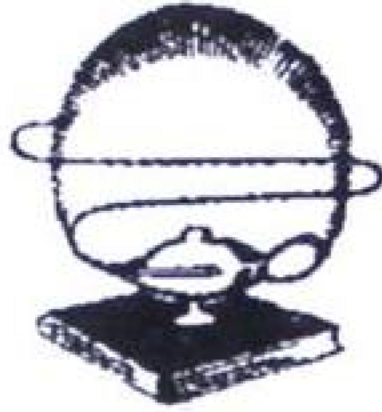
ادب، ثقافت اور دانشوری

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

ادب ثقافت اور دانشوری

صدیق الرحمٰن قدوائی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی



باهتمام: محمد محفوظ عالم

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔110025
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ اردو بازار ۔ جامع مسجد دہلی ۔110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ پرنس بلڈنگ ۔ ممبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونی ورسٹی مارکیٹ ۔ علی گڑھ ۔202002

پہلی بار: اکتوبر ۲۰۰۷ء تعداد: 500 قیمت:-/250 روپے

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس ۔ دریا گنج ۔ نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی

اسلم پرویز کے نام

فہرست

پیش لفظ

اس کتاب کے بارے میں مجھے کوئی خاص بات نہیں کہنی ہے۔ جو کچھ ہے وہ اس کے اندر ہے اور وہ بھی پتا نہیں کس لائق ہے؟ گذشتہ چالیس پینتالیس برس میں جو کچھ بھی لکھا وہ رسالوں میں بکھرا ہوا یا کاغذی کے انبار میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے انھیں مرتب کرنے کا نہ کبھی خیال آیا نہ اتنی تاب تھی کہ اگر خیال آتا بھی تو ان کی تلاش ترتیب اور اشاعت کی تمام منزلوں کو صبر و سکون کے ساتھ طے کرتا۔ اس دوران وقتاً فوقتاً میرے شاگرد جن کی نظروں سے میرا کوئی نہ کوئی مضمون گزر جاتا تھا، اصرار کرتے رہے کہ زبانی جمع خرچ تو آپ نے بہت کیا اور منتشر تحریریں بھی بڑھتی رہیں مگر انھیں یکجا بھی تو ہونا چاہیے۔ یہ احسان میرے شاگرد ڈاکٹر سرور الہدیٰ کا ہے جو مجھے بتائے بغیر خود ہی یہ کام کرتے رہے۔ مجھے جب معلوم ہوا تو شرمندگی بھی ہوئی، خوشی بھی اور حیرت بھی کہ یہ سب کام انھوں نے کیسے کیا ہوگا؟ مطبوعہ مضامین کی تالیف غیر مطبوعہ مسودات کی نقل اور ان سب کی طباعت کی تیاری میں انھوں نے جو مشقت کی ہوگی اس کا اندازہ سب کر سکتے ہیں۔ ان مضامین پر سے وقت کی گرد ہٹائی گئی تو احساس ہوا کہ تبدیلیوں کے ساتھ نشو و نما کا جو عمل جاری رہتا ہے اس کے اثرات کو نظر انداز کرنا ایک اہم حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔ ادب اور اس کے ایک قاری کے درمیان ایک رشتہ ہمیشہ رہتا ہے اور وہ کبھی ایک سیدھی لکیر پر نہیں چلتا۔ اس آئینے میں سارے نشیب و فراز دیکھے جا سکتے ہیں جن سے نہ صرف ایک شخص بلکہ اس کے گرد و پیش اور ان کے ساتھ اس کے رشتے ناتے گزرتے رہے ہیں۔ لہٰذا ان مضامین کی اشاعت کو میں نے بھی غیر ضروری نہیں سمجھا۔

سچ پوچھیے تو یہ مضامین میرے ضرور ہیں مگر کتاب ڈاکٹر سرور الہدیٰ کی ہے۔ شاہد علی خاں صاحب اردو طباعت اور اشاعت کی دنیا میں سب سے زیادہ مقبول و معروف ہیں۔ میں نے اپنی تحریروں کی اشاعت کی طرف جتنی کم توجہ دی ان کا اصرار اور دباؤ اتنا ہی بڑھتا رہا۔

ہمایوں ظفر زیدی صاحب نے جنرل منیجر کی حیثیت سے مکتبہ کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ چنانچہ ہمایوں ظفر زیدی صاحب کی خصوصی دلچسپی کے سبب یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ ان کی توجہ سے بہت سے مسائل حل ہو گئے۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

بیسویں صدی کی سماجیاتی تبدیلیوں کا اثر اردو زبان وادب پر

ہندوستانی سماج میں انیسویں صدی سے جو تبدیلیاں شروع ہوئی تھیں۔ انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان کی عمومی صورت حال میں چند عناصر کو ایسی جگہ عطا کر دی تھی کہ ان کی بنا پر یہاں کا سماج ایک نئی شکل اختیار کر رہا تھا۔ ان عناصر کا اثر ہماری زندگی کے ہر پہلو پر پڑنا لازم تھا۔ چنانچہ اردو زبان وادب بھی نہ صرف ان سے متاثر ہوئے بلکہ ان کا کردار بھی بڑی تیزی کے ساتھ بدلنے لگا۔ سماج اور اس کے مختلف شعبوں کو متحرک کرنے والے یہ عناصر مندرجہ ذیل تھے۔

ا۔ ٹکنالوجی

اس کے اثرات انیسویں صدی سے ہی نمایاں ہو گئے تھے۔ اردو زبان وادب کے کردار میں اس کی بنا پر پہلے پہل تبدیلیاں پرنٹنگ پریس کی آمد سے ہوئیں۔ ادب کے قارئین کا حلقہ نہ صرف بڑھا بلکہ ملک کے مختلف قصبوں میں ایک رابطہ اور تبادلۂ خیال کا سلسلہ شروع ہوا۔ کتابوں کی اشاعت کی رفتار تیز ہوگئی۔ اور ایک نیا طبقہ وجود میں آیا جس کے روزگار کا دارمدار طباعت واشاعت پر تھا۔ اس کی بنا پر قاری اور مصنف کے درمیان ایک کڑی کا ظہور ہوا جو دونوں کو قریب بھی کرنا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ایک طاقت بھی رکھتا تھا جو ٹکنالوجی کے عہد میں بڑھ گئی۔ اور اہم ہو گئیں اگر ایک طرف اس نے ادب کے فروغ اور دور دور تک رسائی میں حصہ لیا تو دوسری طرف

مصنف اور قاری دونوں پر اس کا اختیار بھی بڑھ گیا۔

طباعت واشاعت کو ایک صنف کی حیثیت سے فروغ ہونے لگا اور جدید صنعتی دور کی تمام ترقیوں نے اس کے ذریعے زبان ادب کو اپنے دامن میں لے لیا۔ یہ کاروبار اس حد تک آزادانہ طور پر عمل پیرا ہوا کہ اشتہار بازی Advertising نے بھی کتابوں کی دنیا میں ایک مقام حاصل کر لیا۔

۲۔ صحافت

طباعت کا ہی ایک نتیجہ صحافت کا فروغ تھا۔ انیسویں صدی میں پرنٹنگ پریس کی بدولت ملک کے ہر خطے سے اخبارات شائع ہونے لگے اور کتابوں کی طرح اخبار کی فروخت اخبارات کے وجود کے لئے اہم ہوگئی۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ لوگوں اور علاقوں تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے اخباروں کی زبان میں بھی دھیرے دھیرے تبدیلی آئی۔ اشرافیہ کی سجی سجائی زبان نے دھیرے دھیرے عام بول چال کی زبان کو جگہ دی۔ اس کی بدولت پڑھنے لکھنے والے طبقے میں واقفیت، اطلاعات اور معلومات کا فروغ ہوا۔ مختلف علاقوں اور طبقوں، ادیبوں اور قارئین میں رابطہ اور تبادلۂ خیال کا سلسلہ قائم ہوا۔ چنانچہ ہماری زندگی میں صحافت کا ایک نہایت اہم رول ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی نے اس اثر کو بڑھانے میں بہت مدد کی ہے۔ اردو زبان وادب کے نقطۂ نظر سے صحافت کی بدولت تحریری زبان پر دوررس اثرات پڑے۔ صحافت کے جلو میں جدید ادب کو فروغ ہوا۔ قدیم دہلی کالج کے اساتذہ کے اخبارات، دہلی اردو اخبار، تہذیب الاخلاق اور سرسید تحریک کے اثر سے ظہور میں آنے والے اخبارات ورسائل اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال والبلاغ سے لے کر آج تک ہفتہ وار روزناموں اور ماہناموں کو مدنظر رکھیے تو پتا چلے گا کہ ادب کے بڑے اہم ذخیرے کا ظہور ہی صحافت کی بدولت ہوا۔ ان میں شاید سب سے اہم ادبی شاہکار رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد ہے مگر اس سے قبل اردو میں مضمون نگاری کی صنف کا آغاز صحافت کی بدولت ہو چکا تھا۔

۳۔ تعلیم

ایک اور اہم عنصر جس کا اثر مندرجہ ذیل عناصر پر بھی پڑا۔ وہ ہے ملک کے طول وعرض میں تعلیم کی اہمیت کا احساس اور تعلیمی اداروں کا فروغ۔ یہ سلسلہ بھی انیسویں صدی سے شروع ہوا تھا اور نو آبادیاتی نظام کی ضرورتوں کے پیش نظر برطانوی حکومت نے اس کی طرف خاص توجہ دی۔

لارڈ مکالے کے مشہور و معروف بیان کی عملی شکل انیسویں صدی کے آخر تک اس طمطراق سے ظاہر ہو چکی تھی کہ اکبر الہ آبادی جیسا شاعر اس کی قلعی کھولنے کے لیے آیا اور اس نے جو کچھ کہا اس کا بڑا حصہ درست ثابت ہوا۔ اگر چہ سماجی تبدیلی پر ان کا ردِعمل آج قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ نئے اداروں سے تعلیم لینے والا نیا تعلیم یافتہ طبقہ حکومت کا آلۂ کار بھی بنا۔ نئے پیشوں کی طرف بھی آیا۔ اور اس نے ایک نئے معاشی نظام کو سہارا دیا جس کے زیر اثر متوسط طبقہ بڑھنے لگا۔ تعلیم کا یہ نظام سامراج کے پیدا کیے ہوئے ہر عنصر کی طرح سامراجی نظام کے نئے تضادات کے ساتھ نمودار ہوا۔ تعلیم کے فروغ نے ہی نئے علوم اور اپنے مسائل سے نئی آگہی اور ان کے حل کی تلاش کی طرف مائل کیا۔ اگر ایک طرف اس نئے تعلیم یافتہ طبقے نے نوآبادیاتی نظام کی مدد کی تو دوسری طرف اس طبقے سے نئے اصلاح پسندانہ اور باغیانہ خیالات ابھرے۔ سرسید تحریک کے زیر اثر علی گڑھ اور اسکے بعد گاندھی جی کی تحریک، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پھر ترقی پسند تحریک اور اس طرح کے متعدد رجحانات نئی تعلیم کے ذریعہ ہی ظہور میں آئے۔ آزادی کی جدوجہد اور عالمی تناظر میں، ہندوستان اور ایشاء افریقہ کو دیکھا گیا۔ بیسویں صدی کا سارا اردو ادب شبلی و اقبال چکبست اور پریم چند سے لے کر منٹو عصمت تک نوآبادیاتی دور کے تعلیمی نظام کے اس اندرونی تضاد کا پتہ دیتا ہے۔

۴۔ جنس کی طرف رویہ

بیسویں صدی میں سماج کے نئے حصوں اور طبقوں نے نہ صرف اپنے وجود کو منوایا بلکہ پورے طرز فکر پہ اثر ڈالا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم ہے عورتوں کی بیداری کی تحریکات ان میں تعلیم کا فروغ اور زندگی کے مختلف میدانوں میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لینا۔ ہمارے ادب کا ایک بڑا حصہ ان کی سماجی حیثیت سے متعلق ہے۔ نذیر احمد کے ہاں عورت کی تمام تر سماجی ذمے داری کا دائرہ گھر کی چار دیواری ہے رسوا نے ناول 'امراؤ جان ادا' میں عورت کے ساتھ اپنی تمام ہمدردی کے باوجود اسے ایک مجہول طبقے کی نمائندہ کے طور پر دیکھا تھا۔ بیسویں صدی کے وسط میں ہی عورت ایک باغیانہ طنطنے کے ساتھ آتی ہے۔ عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، منٹو، بیدی غرض کہ اس عہد کے تمام مصنفین کے ہاں اس کا رنگ روپ بالکل نیا نظر آنے لگا۔ عورت کی طرف رویے کا گہرا تعلق نئے تعلیم یافتہ طبقے کی اس نئی آگاہی سے بھی ہے جو جدید علوم نے فراہم کی، ان میں سب سے اہم نفسیات کے علم کے ذریعہ انسان کی انفرادی اور سماجی زندگی میں جنس کی حیثیت

ہے۔ فرائڈ کے نظریے نے ہماری فکر پر اور سماجی رویے پر گہرے اثرات ڈالے۔ جنس کا ذکر بیسویں صدی کے نصف اول تک عموماً فحش سمجھا جاتا تھا۔ مگر اسی زمانے میں اس کی طرف رویہ بدلنا شروع ہوا اور آج فحاشی کا مطلب ہمارے ہاں بالکل بدل چکا ہے۔ عصمت اور منٹو کی وہی کتابیں گھروں، کتب خانوں، اسکولوں اور کالجوں میں ممنوع تھیں۔ آج نہ صرف ہمارے نصابات کا لازمی حصہ ہیں بلکہ ہندستان کے ادب کے نمائندہ تصانیف سمجھی جاتی ہیں۔ آج جنس اور نفسیات سے متعلق ہمارے مصنفین اس دور سے بھی آگے پہنچ گئے ہیں۔

۵۔ علاقائی اور طبقاتی عناصر

اردو ادب کی شستگی اور شائستگی کے معیار وہ تھے جو گذشتہ صدیوں میں اشرافیہ نے طے کئے تھے۔ جن کا تعلق زیادہ تر شہروں اور درباروں سے تھا۔ گاؤں دیہات اردو زبان وادب کے دائرے سے ذرا فاصلے پر تھے۔ دیہاتی، گنوار، دہقانی جیسے الفاظ اس سماجی تفریق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اردو میں ہی نہیں دنیا کے ہر ملک کی زبان میں ایک زمانے تک اس طرح کے رویے ملتے ہیں۔ مگر بیسویں صدی میں رسل وسائل کا فروغ اور مساوات کے تصور نے اونچ نیچ کے سارے تصورات پر کاری ضرب لگائی۔ دیہات جو اردو ادب سے بالکل غائب تھا بیسویں صدی میں ایک اہم موضوع بن گیا ہے۔ پریم چند نے نہ صرف دیہات بلکہ اس کے ذریعے استحصال، ناانصافی اور بدحالی کے ایک نئے استعارے کو جنم دیا جس نے اردو ادب کے سارے منظر نامے کو بدل دیا۔ پریم چند کا دیہات یو پی کا دیہات تھا۔ اس کے بعد سہیل عظیم آبادی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی غیاث احمد گدی اور دوسرے لوگوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے دیہاتوں کو اردو ادب کی حدوں میں لے لیا۔ اردو کے پورے شعر وادب میں دیہات کا جائزہ لیجیے تو دو طرح کا منظر سامنے آتا ہے۔ ایک تو وہ دیہات جہاں ہرا بھرا سبزہ لہلہاتا ہے۔ چشموں اور آبشاروں کی راگ راگنیاں ہیں کہیں دور کوئی چرواہا بانسری بجاتا ہوا ملتا ہے۔ پن گھٹ پر پنہاریاں چہلیں کرتی ہیں اور ان ہی کے درمیان عشق کی پینگیں بھی بڑھتی ہیں۔ دوسری طرف زمینداروں سرکاری کارندوں کے مظالم سے سسکتا ہوا دیہات جہاں فاقے ہیں ذات پات کی اونچ نیچ ہے، اور کسان ڈھور ڈنگروں کی سطح پر زندہ رہتا ہے۔ یہ دونوں مناظر شعور کی دو الگ الگ سطحوں کی اور الگ الگ طبقاتی رویوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اردو ادب میں دونوں رویے ملتے ہیں مگر پہلا منظر ڈھیرے

دھیرے غائب ہو چکا ہے اور دوسرا منظر حاوی ہو رہا ہے۔

۲۔ صنعتی ترقی کے تقاضے

بیسویں صدی کے نصف آخر میں شہر خاص طور سے نمایاں ہو کر آیا۔ یہ شہر آج کا صنعتی شہر ہے اور اس پرانے شہر سے بالکل مختلف ہے جس کا تمام تر وجود جاگیردارانہ دور کے زراعتی نظام پر منحصر تھا آج کا بڑھتا اور پھیلتا ہوا شہر جن نئے مسائل کو لے کر آیا ہے وہ اپنے سارے بھیانک پن کے باوجود ابھی ہمارے ملک میں اس طرح پورے طور پر نمایاں نہیں ہوا جیسا کہ مغرب میں ہو چکا ہے۔

آج آبادیوں کا منتقل ہونا صنعتی نظام کے بڑھنے کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ یہ سلسلہ ہمارے ہاں شروع تو انیسویں صدی میں ہو چکا تھا۔ آج بڑے پیانے پر بیسویں صدی میں خصوصاً بیسویں صدی کے نصف آخر میں نمودار ہوا۔ اردو زبان کے لئے یہ عنصر نہایت اہم رہا ہے۔ انیسویں صدی میں ہی دلی اور لکھنؤ کے ساتھ ساتھ اردو کے نئے مراکز وجود میں آنے لگے تھے۔ خصوصاً لاہور ایک ایک ایسا مرکز تھا جو 1857 کے بعد اہمیت حاصل کرتا ہے۔ اور بیسویں صدی میں اردو کا بڑا ادب زیادہ تر اسی کا مرہون منت ہے۔ ابتداء میں حیدرآباد، رام پور، بھوپال، جیسی دیسی ریاستوں نے بھی اردو کی سرپرستی کی مگر یہاں زیادہ تر کلاسیکی طرز کا ادب ہی ظہور میں آیا۔ نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق انحراف کا ادب ان سب خطوں کے باہر ہی پیدا ہوا۔ لاہور کے بعد فلم کے فروغ کی بدولت بمبئی ایک بڑا ادبی مرکز بنا جو آج تک قائم ہے۔ اس تبدیلی کا گہرا اثر زبان پر پڑا۔ دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا تصور دھیرے دھیرے ایک مقدس یاد بن کر رہ گیا۔

ہندستان کے ہر علاقے سے نیا تعلیم یافتہ طبقہ ابھرا ہوا جو نہ صرف کھڑی بولی اور دوسرے لسانی حلقوں سے تعلق رکھتا تھا۔ بلکہ جس میں کمزور معاشی اور سماجی طبقوں کے لوگ بھی شامل تھے۔ چنانچہ زبان معیار بندی کے اس دور سے گزر گئی جب دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ کا اثر ورسوخ تھا۔ اس کے نتیجے میں زبان میں الفاظ محاوروں اور لہجوں کا تنوع تو آیا مگر اس روایت اور معیار پرستی کا اثر بالکل ختم نہیں ہوا جس کو اردو تہذیب میں صدیوں سے تقدس حاصل تھا۔ چنانچہ اردو زبان اگر دوسری زبانوں سے ممتاز ہے تو اس کا سبب صدیوں کا بنا ہوا شستگی اور شائستگی کا وہ تصور ہے جس میں ش ق کی درستی سے لے کر لہجے کی کھنک الفاظ کے استعمال میں احتیاط روزمرہ اور محاورہ کی

سلاست اور صحت دونوں پر زور شامل ہے۔ اردو میں الفاظ کا خزانہ تو بڑھتا ہی گیا۔ اس کی خوبی یہی ہے کہ کسی خطے پر اس کے دروازے بند نہ ہوئے۔ یورپ کی زبانوں سے بھی الفاظ آئے اور آرہے ہیں۔ مگر اس کھلے پن کے باوجود انجذاب کا عمل بے لگام نہیں ہوا اگر چہ اردو میں اس وقت استناد کا دعوا کرنے کے لئے کوئی ادارہ کوئی شہر اور کوئی گروہ موجود نہیں۔ مگر اردو تہذیب کی عام نفسیات میں کہیں نہ کہیں روایت اور معیار کا تقدس اس قدر جاگزیں ہے کہ اس سے انحراف آسانی سے نہیں کیا جاتا اگر کوئی فرد اس کی کوشش کرتا بھی ہے تو اسے آسانی سے مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔

۷۔ لسانی منظر

گذشتہ پچاس سال میں اردو پر سرکاری رویے کا بھی بڑا اثر پڑا ہے۔ سب سے اہم تو یہ کہ اردو بولنے والا بڑا طبقہ اب اردو بولنے کے باوجود اردو نہیں لکھتا۔ ہمارے ملک میں فرقہ پرستی نے اردو اور ہندی زبان کو خاص طور سے متاثر کیا۔ مادری زبان کا تصور بھی اس کی زد میں آچکا ہے۔ اردو رسم خط تو قائم ہے مگر اردو والوں کا ہی ایک طبقہ دیوناگری رسم خط میں اردو لکھنے لگا۔ یہی نہیں جو لوگ ہمیشہ سے دیوناگری رسم خط ہی جانتے تھے، انھوں نے اردو ادب کو اپنی سہولت کے لیے دیوناگری رسم خط میں لکھنا پڑھنا اور شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہندی کے بڑھتے ہوئے چلن نے اردو زبان کی تعلیمات پر بھی اثر ڈالا ہے۔ اس طرح کچھ یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے عام سطح پر دھیرے دھیرے اردو ہندی کی کوئی ملی جلی شکل پھیل رہی ہے، جو دونوں رسوم خط میں لکھی جارہی ہے۔ اگر زبانیں اور ان کے رسم و رواج عام لوگوں کے چلن سے طے ہوتے ہیں تو ممکن ہے کہ آئندہ اردو اور دیوناگری رسوم خط میں ایک عام بول چال کی زبان ایک شکل اختیار کرے۔

گذشتہ نصف صدی میں اردو کا دامن اس اعتبار سے بھی وسیع ہوا کہ تراجم کے ذریعے یورپ اور ایشاء و افریقہ کی دوسری زبانوں سے بھی اس کا رابطہ قائم ہوا۔ اب بیرونی اثرات صرف انگریزی تک محدود نہ رہے۔ ہائیکو جیسی نئی اصناف کا تعارف ہوا اور پھر ہندوستان کے لوک کلچر اور لوک ادب کے اثرات بھی بڑھے۔ گیت اور دوہا تو اردو میں مدتوں سے رائج تھے۔ ان برسوں میں ماہیا جیسی عوامی صنف کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان شواہد سے یہ خوش آئند امکانات ظاہر ہوتے ہیں کہ مستقبل میں اردو زبان و ادب کو نئی جہتوں میں فروغ ہوگا۔ اس کا بدلتا ہوا رنگ روپ بھی وقت کے تقاضوں کے مطابق ہوگا اور اس کے اپنے امتیازات بھی اس کے ساتھ قائم رہیں گے۔

اردو: مستقبل کے امکانات

اردو زبان کے مستقبل کو عموماً اب تک ہم نے گذشتہ پچاس برس میں حکومت کے فرامین اور فرقہ وارانہ سیاست کے نشیب وفراز سے وابستہ کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں سچائی ہے تو ضرور مگر پوری سچائی بھی نہیں۔ زبان کے فروغ تغیر یا زوال میں حکومتِ وقت کے رویے اور کھلی ہوئی سیاسی سازش کے سوا بھی متعدد عناصر کام کرتے ہیں جن کی طرف ہماری خاطر خواہ توجہ نہیں ہوئی۔ مظلومیت کی نفسیات ہم پر حاوی ہو گئی اور غیروں کے جبر کے ماتم نے ہمیں اتنی فرصت ہی نہ دی کہ اپنے اختیار کے دائرے میں کام کرنے اور اسے وسعت دینے کی کوشش کرتے۔ اب جب کہ پچاس سال کا لیکھا جوکھا ہمارے سامنے ہے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ آنے والے زمانے میں سارے حدود اور مجبوریوں کے باوجود کیا کچھ کر سکتے ہیں کہ اردو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہے۔

اردو صدیوں کے تاریخی عمل میں ہماری ایک تہذیبی ضرورت کے طور پر وجود میں آئی اور اسی لیے اسے ختم نہیں کیا جا سکا۔ اور اردو کی خدمت کرنے کا وعدہ کرنے والے بھی شاید یہ نہیں جانتے کہ اردو ان کی مجبوری بھی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سانس لینا یا کھانا پینا محض کسی کے احسان یا ایثار سے اردو یا کسی بھی زبان کو کچھ زیادہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس جذباتی فضا جو ہمارے چاروں طرف ہے۔ ذرا اوپر اٹھ کر صورتِ حال کا جائزہ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ خود اس زمانے نے اپنے تمام مظالم کے باوجود اردو کے فروغ کے جو امکانات آج ظاہر کئے ہیں وہ اس

سے پہلے کبھی نہیں تھے۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہماری آج کی اردو کیا ہے۔ زبان کے نہ جانے کتنے گوشے ایسے ہیں جنہیں ہم بغیر جانے ہوئے قدرتی طور پر قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ مادری زبان کی تعریف یہی ہے کہ پیدائش کے بعد کان میں کچھ آوازیں پڑنا شروع ہوتی ہیں۔ جس کا احساس نہ سیکھنے والے کو ہوتا ہے اور نہ سکھانے والے کو۔ چنانچہ زبان کی تبدیلیاں بھی قدرتی طور پر زمانے اور سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ آتی ہیں۔ گذشتہ پچاس سال میں ہماری زبان میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کی طرف چند ماہرین لسانیات کی توجہ تو مرکوز ہوئی مگر ان کے مطالعات کا کوئی اثر اردو دنیا پر نہیں نظر آتا۔ ہر زمانے کی طرح آج بھی ہمارے بزرگ اردو کے خاتمے کا اس بنا پر بھی اعلان کر دیتے ہیں کہ آج کے لڑکے زبان بولنا نہیں جانتے۔ دراصل ہر زمانے کے لڑکوں کی طرح آج کے لڑکے بھی زبان اپنے زمانے سے ہی سیکھتے ہیں۔ مگر ہم کو یہ پتہ نہیں کہ آج کی اردو زبان ہے کیا کسی بھی زندہ زبان کے لئے لازم ہے کہ اس کی عصری صورت کا جائزہ لیتے ہوئے مستقل مرتب ہی کیا جاتا رہے تاکہ زبان بولنے والے یا سیکھنے والے الفاظ معنی، تلفظ محاورے وغیرہ کی سند حاصل کرنے کے لئے خلا میں بھٹکتے نہ پھریں۔ ایک زمانہ تھا جب فارسی ہمارے نظام حکومت میں درسی نصاب میں عدالتوں میں روزمرہ کے کاروبار میں بہت اہم تھی۔ سیکھنے کے لائق فارسی سمجھی جاتی تھی۔ اردو نہیں کہ وہ تو ماحول سے آجاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ روایت کم زور پڑنے لگی۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی تک اردو نے فارسی کے اثرات کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ اور کسی حد تک بیسویں صدی کے نصف اول میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر یہی زمانہ وہ ہے جب مغرب کے اثرات بھی ہمارے ہاں آنے لگے۔

اردو اپنے علاقے سے نکل کر ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں خصوصاً شہروں میں بھی پھیلی۔ لازم تھا کہ مقامی بولیوں کا اثر قبول کرتی جیسا کہ ہوا۔ گذشتہ سو سال میں آمدورفت کی آسانیوں نے ہندوستان کے اندر اس عمل کو تیز تر کر دیا چنانچہ علاقائی زبانوں کے اثرات اردو پر پہلے سے زیادہ پڑنے لگے۔ چنانچہ زبان کے اچھے برے یا صحیح وغلط کا پیمانہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ ہر زمانے میں رد و قبول کے قدرتی عمل سے گزر کر کیا کچھ ہماری زبان میں جذب ہوا۔

اس سلسلے میں صرف اسی بات پر آپ غور کرلیں کہ دہلی شہر جہاں کی زبان اردو ہے پچاس برسوں میں کن تبدیلیوں سے گزرا ہے اور اس کا اثر دہلی کی زبان پر کیا پڑا ہے۔ آزادی کے وقت دہلی کی کل آبادی ۵ لاکھ تھی۔ اس میں سے اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد پاکستان چلی گئی۔ جو لوگ رہ گئے ان میں بہت کم ایسے ادیب شاعر یا اہل زبان تھے جو معیار ساز سمجھے جا سکتے تھے۔ آج دہلی کی آبادی ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔ یہ ایک کروڑ لوگ زیادہ تر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے اور دہلی کی زبان پر جس طرح اثر انداز ہوئے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ آج دہلی کی زبان کیا ہے۔ ہم نے کتابوں میں جس دہلوی اردو کو پڑھا ہے ظاہر ہے اب ہم سے دور ہو گئی مگر اس کے باوجود دہلی میں اردو آج نہ صرف ہے بلکہ باہر سے آنے والے لوگ اسے قدرتی طور پر سیکھتے ہیں۔ لکھنؤ، حیدرآباد کی زبان وغیرہ کا بھی اندازہ اس ایک مثال سے کیا جا سکتا ہے، چنانچہ ہمیں آج کی جیتی جاگتی اردو پر توجہ کرنی ہوگی کہ آنے والے دور کے زبان بھی انھیں خصوط پر بنے گی۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کیا کچھ وہ ہے جو اِس عمل سے گزر رہا ہے اور اس کا اردو پن مشکوک ہے، ہم نے اس سارے مسئلے کے مطالعہ اور اس کے عملی نتائج کا احاطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

عالموں، شاعروں ادیبوں اور استادوں نے اپنی پسند ناپسند کو نافذ کرنے کی کوشش اور صحیح و غلط کا فیصلہ کسی منطقی سبب سے نہیں بلکہ من مانے طور پر کیا۔ لغات و قواعد پر اور جو پرانی ہو چکیں اور جن کی تدوین میں بھی کتاب کے مرتب کا ذاتی فیصلہ بھی زیادہ نمایاں تھا نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے ادارے منظم طور پر اس کو حل کرنے کی طرف پر توجہ کریں۔ مگر زبان کے جائزے سے اور ترتیب و تدوین کا یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہمارے ادارے خصوصاً یونیورسیٹیاں، اکاڈمیاں وغیرہ اس کے لیے کچھ لوگوں کا خصوصی تقرر کریں اور آج کل اس قسم کے فیلڈ ورک کے لیے جتنے وسائل درکار ہوتے ہیں انھیں بہم پہنچائیں اور ایسا مستقل انتظام ہو کہ یہ کام آئندہ بھی جاری رہے۔

آج کل سائنس اور تکنالوجی کے بڑھتے ہوئے اثر کو شیطانی قوتوں کا عروج سمجھا جاتا ہے۔ بات صحیح بھی ہے مغرب کی سرمایہ دارانہ اور سامراجی معاشرت کی نقالی میں ہر میدان میں ہم

نے Privatization کے نام پر نری اور برہنہ دولت خواہی اور نمائشیت کو جو کھلی چھوٹ دی ہے اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے، جب تک کہ ہم خود اس کی چوٹ نہ محسوس کریں۔ اس کے منفی اثرات کو نہیں جان سکتے۔ آج کا گھائل انسان کبھی نہ کبھی تو تڑپے گا مگر یہ تو ایک الگ تفصیلی بحث کا موضوع ہے۔

آج کی زندگی کا سب سے بڑا Villain میڈیا کو سمجھا جاتا ہے۔ جو ہر گھر کے اندر بغیر پوچھے وارد ہو گیا اور کچھ اس طرح پاؤں پھیلا رہا ہے کہ ہر گھر کا وہی مالک ہوتا جاتا ہے۔ اردو کا اس سے کیا تعلق ہے؟ زبان بصری اور سمائی میڈیم کا خام مواد ہے اور کوئی بھی میڈیم زبان سے جتنی بھی کھلواڑ کرے وہ اس حقیقت سے آزاد نہیں ہو سکتا کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک نہ صرف پہنچنا ہے بلکہ اس کے ذریعے اس پیغام کو سننے والوں اور دیکھنے والوں کے جذبہ واحساس میں سمونا، آج کل اشتہارات کی بھرمار سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے۔ چنانچہ میڈیا اپنی شیطانی سرشت، کے باوجود لوگوں کے لسانی عادت اور ضرورت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ سنیما کی زبان گرچہ زیادہ تر اردو ہی ہے اور آج کے اسٹیج ڈرامے سے لے کر ٹی وی تک اردو کا اثر دیکھ کر اگر محسوس ہوتا ہے کہ وہ سرکاری ہندی سے بہت زیادہ مغلوب نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ہماری زندگی میں اردو زبان کی جڑیں اتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں کہ گذشتہ پچاس سال میں وہ بدلتی رہی ہے۔ مگر اپنی اس صفت کی وجہ سے زندہ ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے اثرات کو ضرورت کے مطابق جذب کرتی رہی ہے، انیسویں صدی کے وسط تک اردو کو ہندی کہا جاتا تھا۔ پھر اردو ہندی کا تنازعہ اتنا بڑھا کہ ہندی نے اپنی ایک الگ شناخت بنائی اور بیسویں صدی میں اردو اور ہندی ہم سب کے ذہنوں میں دو الگ الگ لسانی اکائیاں ہو گئیں۔

مگر عام بول چال کی سطح پر سارے مسائل کے باوجود ایک زبان تھی جو بڑھتی اور پھیلتی رہی اسے ہندوستانی بھی کہا گیا۔ ملک کی فرقہ وارانہ سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج مسلمان اسی زبان کو اردو اور ہندو اسی زبان کو ہندی کہتے ہیں۔ ریڈیو۔ ٹی وی۔ سنیما اسٹیج پر زیادہ تر اسے ہندی ہی کہا جاتا ہے۔ اگر چہ اب کبھی کبھی اردو کا نام بھی دکھائی دینے لگا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک اور حقیقت بھی سامنے آئی ہے۔ اردو کا نہ صرف بڑا حصہ دیوناگری میں شائع ہو کر مقبول ہونے لگا ہے بعض علاقوں میں آزادی کے بعد تعلیم حاصل کرنے والے لوگوں نے دیوناگری رسم خط میں ہی اپنی

روزمرہ کی زبان لکھنی شروع کردی ہے۔ ان حالات میں ایک بات ضرور ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ آج کی عام بول چال کی زبان جسے اردو بھی کہا جاتا ہے اور ہندی بھی خود بخود دونوں رسومِ خط میں لکھی جانی لگی ہے۔ کمپیوٹر کے استعمال کے فروغ کے بعد اردو کے اپنے رسم خط کے سلسلے میں جو تکنیکی رکاوٹیں سمجھی جاتی تھیں وہ اب نہیں رہیں۔ وہ زمانہ اب نہیں رہا کہ جب اردو رسم خط کو طباعت واشاعت کے لیے ناکافی سمجھا جاتا تھا اور اس کی بنا پر رسم خط کی تبدیلی کی بات کہی جاتی تھی۔ اس صورت حال میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کے اپنے رسم خط کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے لئے دیوناگری رسم خط کا چلن بھی جو ہندی جگت نے قبول کرلیا ہے جاری رہے گا۔ یعنی آج کی زبان دونوں رسوم خط میں پروان چڑھے گی۔ ہندی کے ساتھ ہی ساتھ انگریزی میں اردو کے ادب کے تراجم کے فروغ کے نتیجے میں اردو رسم خط سے ناواقف لوگوں میں رسم خط سیکھنے کی خواہش کا پیدا ہونا بھی کوئی حیرت کی بات نہیں۔ یہ عمل بہت بڑی تعداد میں تو نہیں مگر کسی حد تک اثر ڈال رہا ہے۔ وہ تعصب جو آزادی کے بعد کے دنوں میں تھا اب نہیں رہا۔ نئے لوگ جن کی زبان اردو نہیں ہے وہ بھی اردو سیکھنے کی طرف مائل ہورہے ہیں۔ اور مختلف ذرائع سے اردو زبان سے متعارف ہورہے ہیں۔ میڈیا کے سارے حدود کے باوجود یہ حقیقت بھی نہیں بھولنی چاہئے کہ جس ملک میں خواندگی بہت کم ہو، اور اردو رسم خط کو اور بھی کم لوگ، جانتے ہوں وہاں بصری اور سماعی میڈیا تحریری زبان کے مقابلے میں زیادہ اہم رول ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک پہلو یہ ہے کہ شعروادب کا اچھا خاصا حصہ عام لوگوں تک کتابوں کے ذریعے ہی نہیں، میڈیا کے ذریعے بھی پہنچ رہا ہے۔ اردو شاعری کی مقبولیت میں میڈیا نے ایک اہم رول ادا کیا ہے، فکشن کے بھی اعلا نمونے اب اکثر ٹی۔ وی پر آتے ہیں۔ یہ سرکاری جبر ہو یا سیاسی دشمنی ہو، یہ سب عوام کی خواہش کے آگے کسی نہ کسی طرح بے دست و پا ہیں۔ جب ہمارے ہاں T.V تمام تر سرکاری تھا تو پاکستان کے اردو ڈرامے گھر گھر ویڈیو کے ذریعہ پہنچ جاتے تھے۔ آج بھی پاکستان کے اردو ڈرامے مقبول ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہاں کے میڈیا نے زبان کے ذریعہ خود اپنا دائرہ قائم کرلیا ہے۔

ہمارے سماج میں مکاری کے فروغ سے بعض اصطلاحات کا چرچا بہت ہوا۔ یہ

اصطلاحات اپنی شکل اور صورت میں بڑی معصومانہ اور شریفانہ ہیں مگر ان کا مقصد زیادہ دھوکے بازی رہا ہے۔ ان اصطلاحات میں ایک ہے قومی یکجہتی۔ اس کے اور پہلو تو فی الحال الگ رکھئے صرف زبان کی حد تک اسکے استعمال پر غور کیجئے۔ گذشتہ سو سال میں عموماً اور پچاس سال میں خصوصاً ایک انتہائی عجیب بات کو وقار بخشنے کی کوشش کی گئی اور وہ یہ ہے کہ اردو والے اپنی زبان سے فارسی اور عربی کے الفاظ اور ہندی والے سنسکرت کے شبد گر نکال دیں تو نہ صرف زبان کا مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ ہندو مسلم بھائی بھائی بھی ہو جائیں گے۔ اور اگر رسم خط بھی ایک ہو جائے تو اردو پڑھنے والوں کا حلقہ بڑھ جائے گا۔ یہ ناواقفیت اور کم سوادی ہمارے سیاسی لیڈروں کی پھیلائی ہوئی ہے۔ جن کی سمجھ بوجھ پر یوں بھی اب سب کا بھروسہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے، ہم بھی اکثر یہی راگ الاپنے لگتے ہیں۔ زبانوں کا ارتقا اپنے جلو میں جن صفات کو لایا ہے انہیں ہم اتنی آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اردو اور ہندی میں دوسری زبانوں کے الفاظ اور رسم خط اپنے پیچھے ایک طویل تاریخ رکھتے ہیں۔ پھر لسانیات کے عام احوال کے مطابق اگر ہر زبان دوسری زبانوں کے الفاظ کو قبول کر کے اپنے دامن کو وسیع کرتی ہے تو اردو اس سے مستثنیٰ کیسے ہو سکتی ہے۔ جن زبانوں کو جن قدرتی عمل سے دور کرنے کی کوشش کی گئی ان کا حشر بھی تاریخ کے صفحات پر رقم ہے۔ اردو کے لئے یہ بات سرمایۂ افتخار ہے کہ جس زمانے میں ایشیا کے ایک بڑے حصے میں فارسی زبان و ادب اپنی بلندیوں پر تھے اس نے فارسی سے بہت کچھ حاصل کیا۔ یہی عمل بعد میں بھی جاری رہا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی سے ہم نے مغربی زبانوں خصوصاً انگریزی سے اثر لیا۔ کسی زبان کو بھی بیرونی زبان قرار دینا یا کسی بھی تہذیبی عنصر کو جسے ہم نے قدرتی طور پر قبول کر لیا ہے دیس نکال دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اور پھر اردو زبان بھی اگر سو فیصدی ہندوستان کی کسی بھی دوسری زبان کا چربہ ہو جائے تو اس کی اپنی صفت کیا رہی۔ جس کی بنا پر کوئی اسے سیکھنا پسند کرے۔ اگر اردو میں کچھ اپنا کچھ نیا اور کچھ مختلف نہیں رہے گا تو پھر اس زبان کے وجود کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آج تک کسی ایک زبان کے بولنے والوں سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا کہ ذرا اپنی امتیازی خصوصیات کو چھوڑ کر ہماری جیسی باتیں پیدا کر لو تا کہ ہم بھی تمہاری زبان سیکھ سکیں، یہ مطالبہ ذرا فرانسیسیوں سے کر کے دیکھئے یا اپنے ہی ملک میں بنگالیوں سے چھیڑ چھاڑ کیجئے پتہ چل جائے گا۔

اس کا تو صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے جو لوگ کسی زبان کو اس کی اپنی شرطوں پر نہیں سیکھ سکتے وہ مہربانی فرما کر نئی زبان سیکھنے کی زحمت نہ فرمائیں۔

ایک بات جس کا ہم اردو والوں نے گذشتہ پچاس برسوں میں بہت چرچا کیا وہ ہے اردو کا روزی روٹی سے تعلق نہ ہونا۔ میری حقیر میں رائے میں اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ لوگ جو اردو کے سوا کچھ اور سیکھنا نہیں چاہتے اور پھر بھی نوکری چاہتے ہیں سرکاری دفتروں یا یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں ان کا کوئی انتظام کیا جائے۔

حکومت نے اردو کی طرف جو کچھ بھی رویہ رکھا اسے کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن کیا یہ آج حقیقت نہیں ہے کہ ہر شخص جو کسی نہ کسی جگہ تعلیم حاصل کرتا ہے اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی اور ہندی لازماً سیکھتا ہے کہ وہ نصاب میں شامل ہے۔ اور ہندوستان جیسے ملک میں ہر شخص کو ذولسانی اور سہ لسانی ہونا ہے بشرطیکہ وہ اپنے گاؤں سے نکلنا چاہے، اگر اسے اپنی علاقائی زبان کے ساتھ اردو بھی آتی ہے تو اردو کی سماجی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اس کے روزگار کے امکانات ان سے زیادہ ہونے چاہئیں جنہیں صرف ایک زبان آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندی کی سرکاری حیثیت ہونے سے اس میں ملازمت کے امکان اردو سے کہیں زیادہ ہیں۔ مگر اردو کسی کی راہ کا روڑہ کب اور کہاں بنی۔ سرکاری دفتروں اور تعلیمی اداروں میں سبھی کیلئے روزگار کے امکانات کم ہیں، اردو والوں کے لیے اور بھی کم ہیں۔ ہم ایک شہری کی حیثیت سے بجا طور پر اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔

آج کہا جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں متوسط طبقہ بڑی تیسری سے پھیل رہا ہے۔ جس کا اثر زندگی کے ہر شعبہ میں بڑھ رہا ہے۔ اس طبقہ نے اپنے روزگار کے امکانات پیدا کئے ہیں۔ اس میں مہم جوئی اور حوصلہ اور اپنے مفاد کے حصول کے امکانات پیدا کرنے کے لئے تمام ذرائع حاصل کرنے کی خواہش اور صلاحیت ہوتی ہے۔ اردو والے اس صورتحال میں کہاں ہیں۔ اس مسئلے کا گہرا تعلق تعلیم سے ہے۔ یہ تو بہت کہا جاتا ہے کہ اردو والے اپنے بچوں کو اردو نہیں سکھاتے مگر کیا آج حقیقت یہ نہیں ہے کہ سرکاری اسکولوں میں عموماً نچلے طبقے کے لوگ تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان میں اردو، ہندی اور دوسری ہندستانی زبانوں کو پڑھنے والوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔

اردو، ہندی اور ہندوستانی کی بحث

اُردو ہندی، ہندوستانی کی بحث کو اب سو سال سے زیادہ ہو گئے۔ زبان کا مسئلہ حل ہونے کی بجائے پیچیدہ ہوتا گیا۔ تہذیبی سوال کو سیاسی جہتوں کی طرف موڑا گیا اور سیاست بھی مصلحت اندیشی، ناواقفیت اور اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے محض مقبولیت حاصل کرنے کے مقصد پر مرکوز رہی۔ اس سارے معاملے کی تفصیلات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اب بھی لکھا جا رہا ہے۔ حقائق کی تعبیر اب سب اپنے اپنے گروہ کے مفادات کے مطابق کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جس سیاسی گروہ کے پاس اقتدار رہا وہ منتشر اور متضاد مفادات کا شکار ہونے کے باوجود بعض مسائل پر متفق تھا، کم از کم ان کے بااثر طبقے کا لسانی اور تہذیبی رویہ اردو کے حق میں نہیں تھا۔ آزادی کے بعد ایک بڑی غلط فہمی کا بڑا زور دار چرچا ہوا اور وہ یہ تھا کہ دو قومی نظریہ پاکستان کے قیام کے ساتھ وہیں چلا گیا اور ہندوستان اس سے بری ہو گیا حالانکہ ہمارے ملک میں دونوں نظریوں کے ماننے والے اور ان پر عمل کرنے والے نہ صرف باقی رہے بلکہ اتنے سرگرم رہے کہ آج وہ سب کچھ جس کے سہارے آزادی کی جدوجہد ہوئی تھی پسِ پشت ڈالا جا رہا ہے، اسے پھر سے حاصل کرنے کی کوشش یقیناً ہو رہی ہے اور بسا اوقات بار آور ہوتی ہوئی بھی نظر آتی ہے مگر پھر بھی ہم اپنے ملک کے اندر ایک شدید جدوجہد کے دور سے گزر رہے ہیں جس کا تقاضا ہے کہ یہ واضح ہو کہ کون اس معرکے میں کس طرف ہے۔

آج ہماری تہذیب کے بارے میں بھی بہت سے سوال اٹھائے جا رہے ہیں۔ جعلی حقائق کی بنا پر نہایت غیر منطقی فیصلے کیے جا رہے ہیں۔ زبان بھی ہمارے ان ہی تہذیبی مسائل میں سے ایک ہے۔ مندرجہ بالا مضمون میں اردو ہندی اور ہندوستانی سے متعلق بحث کا جائزہ لینے میں جو نتائج نکالے گئے ہیں ان سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اب دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آ چکا ہے جو ان غیر منطقی فیصلوں کو نہ صرف قبول نہیں کرتا بلکہ انہیں موثر طور پر چیلنج کر رہا ہے۔ اس مضمون میں متعدد سوالوں کا ذکر ہے ان میں آلوک رائے کی کتاب 'ہندی نیشنل ازم' سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہ ان تازہ ترین کتابوں میں ہے جس میں زبان کے مسئلے کو اس کے تمام تاریخی،

سیاسی اور تہذیبی رشتوں کے ساتھ رکھ کر دیکھا گیا ہے اور اس سازش کو بے نقاب کیا گیا ہے جو بظاہر ہندی کی حمایت میں ہے مگر دراصل نہ صرف اس نے ہندی کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے بلکہ جو ملک کو تہذیبی طور پر فرسودگی، ماضی پرستی اور فرضی تاریخی تصورات کے دلدل میں لے جا رہا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے اردو والے ان حلقوں سے بھی متعارف ہوں گے جو اردو کے مجاہدین، نہیں ہیں بلکہ ملک میں سرگرم ان فاشسٹ قوتوں کے خلاف صف آرا ہیں جو تہذیب کے ہر میدان میں اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں جن کا پہلا حملہ لسانی محاذ پر اردو کے خلاف ہوا تھا مگر اس کے نتائج سے آج ملک کا سارا ہوشمند طبقہ متفکر ہے۔ اس سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اردو کے حقوق کا معاملہ صرف اردو والوں سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان سب لوگوں کا مسئلہ ہے جو بنیادی جمہوری انسانی حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں۔ لہٰذا اردو والوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اس بڑی جدوجہد میں سرگرم ہوں اور ان لوگوں کے دوش بدوش آئیں جو مختلف لسانی گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندی کے ادیبوں اور شاعروں میں بھی ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہے جن سے ہمارا کوئی تصادم نہیں۔ مسائل کے بارے میں اختلاف رائے بھی ہوسکتا ہے، اختلافِ رائے کو 'دشمنی' سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

اس مضمون میں اردو اور ہندی کے تنازعے کی تاریخ کا بھی مختصر حوالہ دیا گیا ہے۔ عام طور سے یہ بات تقریباً ہر حلقے میں دہرائی جاتی رہی ہے کہ اس قضیے کا آغاز فورٹ ولیم کالج سے ہوا اور اس کی ساری ذمے داری انگریزوں کے سر ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں مندرجہ ذیل حقائق کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔

۱۔ فورٹ ولیم کالج کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مرضی کے خلاف لارڈ ویلزلی نے قائم کیا جو ذاتی طور پر اس کا قائل تھا کہ اگر ہندوستان پر انگریزوں کو مستحکم اقتدار قائم کرنا ہے تو اس کے کارندوں کو یہاں کی زبانیں سیکھنی ہوں گی۔ خصوصاً وہ زبان جو زیادہ لوگوں سے رابطے میں مدد کرے۔

۲۔ گل کرسٹ کے نزدیک یہ زبان ہندوستانی تھی جس کا سب سے بڑا مستند نمونہ مرزا رفیع سودا کا دیوان تھا۔ گل کرسٹ ایک غیر ملکی محقق ہونے کی بنا پر جسے تدریس سے دلچسپی تھی، اس ہندوستانی کے مختلف روپ دریافت کرنے اور انہیں تحریر میں لانے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ ہندوستان اور یہاں کی زبانوں کی تاریخ اور ان کی نوعیت کے بارے میں اس کا علم بہت ناقص تھا۔ وہ صرف اپنے طور پر اپنے بہت محدود وسائل کی مدد سے جو کچھ حاصل کرتا تھا اس سے نتائج

نکال لیتا تھا۔ اس کی لغات اغلاط سے بھری پڑی ہیں مگر ہر نئے اڈیشن میں اپنی بساط بھر وہ ان کی تصیح بھی کرتا رہا جس کا مقصد کوئی نئی زبان وضع کرنا نہیں بلکہ اپنی محدود معلومات کے مطابق تجربہ کرنا تھا۔ اس نے شکنتلا ناٹک دیوناگری میں لکھوا کر یا ہندوستانی میں سے فارسی الفاظ نکال کر اگر سنسکرت کے الفاظ رکھوانے کی کوشش کی تو یہ اس قسم کا تجربہ تھا جیسا کہ انشاء اللہ خاں انشاؔ کا رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی' لکھنے کا۔ یہ دونوں تجربے حقیقت سے دور محض فرضی صورتِ حال کی عکاسی کرتے تھے۔

۳۔ فورٹ ولیم کالج میں 'باغ و بہار' یا اس جیسی دوسری کتابیں اردو میں فارسی اور عربی الفاظ کی بھرمار کرنے کے لیے نہیں لکھوائی گئیں بلکہ ان کا مقصد اس عہد کی بولی جانے والی عام زبان میں ایک مشہور داستان کو پھر سے لکھوانا تھا۔ 'نوطرزِ مرصع' پہلے سے موجود تھی۔ گل کرسٹ نے اس کو مدنظر رکھ کر 'باغ و بہار' لکھوائی۔ 'نوطرزِ مرصع' بہت فارسی آمیز تھی۔ 'نوطرزِ مرصع' کے مصنف تحسین کے سامنے اس سے پہلے کوئی اردو نثر کی کتاب نہیں تھی، وہ بھی فارسی میں لکھتے تھے۔ اس لیے جب انہوں نے 'نوطرزِ مرصع' لکھی تو ان کے سامنے نمونے فارسی نثر کے ہی تھے اور ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگوں میں اس قسم کی نثر اجنبی نہیں تھی کیونکہ وہ عموماً صرف فارسی سے آشنا تھے بلکہ ان کی عام زندگی میں فارسی رچی بسی تھی۔ 'باغ و بہار' میر امّن نے لکھی اور شیر علی افسوس وغیر کی نظروں سے گزری۔ میر امّن کے مطابق اس کی زبان دہلی کے محاورے کے مطابق تھی۔ اس دعوے کو جانچنے کے لیے دلّی کا ایک قصہ خواں مقرر کیا گیا جس سے قصہ سن کر اس کی زبان کو پرکھا گیا۔

میر امّن کی زبان وہی ہے جو میرؔ و سوداؔ کی زبان ہے اس لیے فورٹ ولیم کالج یا گل کرسٹ کی طرف سے ایسی کسی کوشش کا ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے اردو سے عام الفاظ نکال کر اس میں فارسی کے الفاظ کو زبردستی شامل کیا ہو۔ فارسی کے جو الفاظ اردو میں قدرتی طور پر آ کر جذب ہو چکے تھے خواہ اپنی شکل وصورت بدل چکے ہوں، ویسے کا ویسے قبول کیے گئے میر امّن کی زبان اور میر و سودا کی زبان ایک ہی ہے۔

گل کرسٹ کے مطابق یہ ہندوستانی ایک Middle Language تھی جو یہاں کی قدرتی بول چال کی زبان تھی جس میں فارسی اور سنسکرت وغیرہ کے الفاظ کا تناسب اتنا ہی تھا جتنا کہ اس زبان کے عام بولنے والوں نے خاموش طور پر قبول کر لیا تھا۔

۴۔ فورٹ ولیم کالج کا وہ دور جب اس کی اہم ترین کتابیں مرتب ہوئیں، ۱۸۰۵ء تک یعنی

صرف پانچ برس رہا۔ اس سال ویلزلی اور گل کرسٹ دونوں ہندوستان سے واپس چلے گئے۔ یہ ویلزلی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس ناراضگی کی سزا تھی کہ اس نے کمپنی کی اجازت کے بغیر فورٹ ولیم کالج قائم کر کے اتنی بڑی فضول خرچی کی کہ کمپنی کا خزانہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

۵۔ انیسویں صدی کے وسط میں ہندی کے چند احیا پرستوں نے بول چال کی زبان سے فارسی کے الفاظ نکال کر سنسکرت کے الفاظ شامل کرنے کی کوشش کی تو انہیں ایک بنا بنایا نمونہ فورٹ ولیم کالج کی شکنتلا ناٹک جیسی کتابوں میں مل گیا۔ مگر اردو میں زور ہمیشہ عام بول چال کی زبان اور روز مرہ اور محاورے پر دیا گیا گرچہ فارسی کا اثر ہمیشہ رہا، کسی مصنف کے ہاں کم، کسی کے ہاں زیادہ۔ زبان اور اسلوب میں یہ ترجیح تخلیقی فیصلہ بھی تھا۔ مثلاً غالبؔ کی شاعری ایک زمانے میں فارسی آمیز تھی مگر ان کی نثر عام بول چال کی زبان کی سب سے اعلیٰ مثال بن گئی۔ اسے تعصب یا علیحدگی پسندی نہیں کہا جا سکتا۔

جب ہم خود زبان کو بنیاد بنا کر ایک ہی زبان کو مصنوعی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر کے 'اردو والے' اور 'ہندی والے' بن گئے تو انگریز اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتے۔ اپنے دشمن کو ہم بے وقوف کیوں سمجھتے ہیں؟

مندرجہ بالا مضمون کے ضمن میں چند باتوں کا ذکر اس لیے لازم ہے کہ وہ لوگ جو زبان کے معاملے میں سنجیدہ مطالعہ کرتے ہیں اور تعصبات سے بلند ہیں وہ بھی بعض اوقات چند مفروضات کو اس لیے مان لیتے ہیں کہ تاریخ کے بعض حقائق کو مسخ کر کے ان مفروضات کو ہی بار بار دہرا کر حقائق کے طور پر پیش کیا جانے لگتا ہے۔ انگریزوں کے مظالم اپنی جگہ ہیں مگر ہم اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کر سکتے کہ ہمارے ملک میں ایسے گروہ بھی پنپ رہے تھے جو انگریزوں کے سامراج کو قوت بہم پہنچا رہے تھے اور یہ گروہ ان احیا پرستوں کے تھے جنہوں نے آزادی سے پہلے 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کو زبان اور فرقے کی بنیاد پر تعصبات پھیلا کر قائم رکھا اور آزادی کے بعد بھی اسی پر عمل کر رہے ہیں۔

سماج سازی اور زبان وادب

(جعفر حسن کے مضمون مشمولہ اردو ادب کے حوالے سے)

زبان وادب زندگی کی طرح حرکت پذیر ہے۔ اور تغیرات کی بدولت نمودار ہونے والے وسائل کی بنا پر دونوں کے رشتے کی تعبیرات کے سلسلے میں اختلافات بھی نمودار ہوتے رہے ہیں۔ اردو میں تفصیلی طور پر سب سے پہلے حالی نے اس کی طرف توجہ دی۔ اس کے بعد ہمارے ہاں مستقل اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ لکھا گیا مگر حالی کا اثر مدتوں تک کسی نہ کسی شکل میں مختلف مصنفین کے ہاں نمودار ہوتا رہا۔ حالی اور سرسید تحریک سے متعلق لوگوں نے جب ادب اور زندگی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تو ان کی نظر میں زندگی کا اور ان کے عہد کے اجتماعی اور انفرادی تقاضوں اور ان کے بارے میں خود ان کے تصورات۔ اس کے بعد بیسویں صدی کی تیز رفتار تبدیلیوں نے اس سوال کو تازہ کیا۔ ہمارے تخلیقی ادب کے بڑے نمایندوں میں اقبال کی شاعری اور پریم چند کی کہانی میں خاص طور سے یہ نمایاں ہوا۔ اور پھر ترقی پسند تحریک نے اسے نظریاتی طور پر ایک نئی جہت دی۔ حالی اور سرسید نے جس سماج اور زندگی کی بات کی اس کی سربراہی طبقۂ اشرافیہ کے ہاتھ میں تھی جو ماضی کا ورثہ لیے ہوئے مستقبل کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انیسویں صدی میں ظہور میں آنے والا متوسط طبقہ اس کے زیر اثر آگے بڑھ کر سماج کی باگ ڈور دھیرے دھیرے اپنے ہاتھوں میں لے رہا تھا۔ نوآبادیاتی نظام نے اس عمل کو اور بھی سہارا دیا۔ اس زمانے میں جہدِ آزادی گاندھیائی تحریک اور پھر سوشلزم کی تحریک کے زیرِ اثر اردو میں ترقی پسند تحریک ظہور میں آئی جس نے زندگی سماج اور ادب سے متعلق سوالات پر نئے سرے سے غور کیا۔ انہوں نے سوشلسٹ نظریے کے زیرِ اثر ایک انقلاب کا تصور پیش کیا جہاں سماج اور زندگی کی باگ ڈور محنت کش طبقے کے ہاتھ میں ہو۔ انہوں نے بڑے وسیع پیانے پر ایسے ادب کو پروان چڑھایا جو سرمایہ دارانہ اور بورژوا نظامِ زندگی کی تنقید کرتا تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں سرسید تحریک اور بیسویں صدی کے

تقریباً وسط میں ترقی پسند تحریک نے زندگی کو بدلنے میں زبان و ادب کے رول اور ادب و زبان کی تبدیلیوں میں زندگی کے رول پر اپنے نقطۂ نظر سے کھل کر بحث کی۔ اور جو ادب ان دونوں تحریکات کے زیر اثر وجود میں آیا وہ وقیع اور ہماری پوری ادبی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔ جعفر حسن صاحب کے اس مضمون میں ان کے عہد کے عام تصورات کے اثرات بھی ملتے ہیں اور سماجیات وحیاتیات سے اخذ کیے ہوئے تصورات کی جھلک بھی ملتی ہے جو ان کے مطالعے کے خاص موضوعات تھے۔

اس مضمون میں سب سے پہلے انہوں نے مادری زبان کی نوعیت پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ سماج سازی (Socialization) اور باز سماج سازی (Resocialization) کی اصطلاحات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں ''ہر بچے پر اپنے ماحول کا سب سے پہلا اور زبان کی وجہ سے نمودار ہوتا ہے اور ہر بچہ جس عمدگی سے اپنی مادری زبان ہنستے کھیلتے سیکھتا اور مشق و محنت سے جو پختگی وہ اپنی مادری زبان میں حاصل کرتا ہے وہ کوشش اور محنت کرنے پر بھی غیر زبان میں حاصل نہیں کرسکتا...... '' آگے چل کر وہ یہ بھی کہتے ہیں ''مادری زبان سے لازمی طور پر ماں کی زبان مراد نہیں ہوتی۔ دوسری عالم گیر جنگ کی وجہ سے بہت سے بچے جیتے .جی اپنے ماں باپ سے اور وطن سے چھوٹ کر پردیس میں پرورش پا رہے ہیں ان سب کی مادری زبان اس لک کی زبان ہے جہاں وہ سیانے ہور ہے اور ہوش سنبھال رہے ہیں...... غرض دنیا کا ہر بچہ جو زبان قدرتی طور پر سیکھتا ہے وہی اس کی مادری زبان ہے چاہے اس کی ماں کی زبان حقیقت میں کچھ اور ہی کیوں نہ ہو۔ گویا مادری زبان سے مراد ماں کی زبان نہیں بلکہ ماحول کی زبان ہے''۔

مادری زبان کے سلسلے میں ان کے بیانات پر آج کے حالات میں غور کیجیے تو دو سوال اٹھتے ہیں:

آج کی زندگی میں خصوصاً آزادی کے بعد ہندوستان میں 'مادری زبان' کی حقیقت کیا ہے؟
ہندوستان کے اندر اور بیرونِ ہند میں آبادی منتقل ہوتی رہی ہے اور ہو رہی ہے۔ یہ لوگ مادری زبان کے کس مسئلے سے دو چار ہیں؟

پہلے سوال کے سلسلے میں جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اب جسے

سرکاری یا رسمی طور پر مادری زبان قرار دیا جاتا ہے وہ نہ تو بولنے والوں کی مادری زبان ہوتی ہے نہ ماحول کی زبان۔ اس کی ایک عام مثال اردو اور ہندی کو مادری زبان قرار دینے والوں کے یہاں ملتی ہے۔ شمالی ہند کے کسی ایک علاقے کے ایک ہی محلے اور ایک ہی ماحول کے دو لوگ جو ایک ہی زبان بولتے ہیں وہ اپنی اپنی مادری زبان الگ الگ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ایک کے نزدیک وہی زبان اردو ہے اور دوسرے کے نزدیک ہندی۔ دونوں سے مراد کھڑی بولی کی دو ترقی یافتہ شکلیں ہیں جو الگ الگ دکھائی دیتی ہیں۔ مگر اس کا پورا امکان ہے کہ دونوں کی مادری زبان کا کھڑی بولی سے بھی بس دور کا ہی تعلق ہو۔ مثلاً اتر پردیش میں اودھ کے علاقے میں پلنے بڑھنے والے ہر شخص کی مادری زبان لازماً اودھی یا اس کی کوئی شکل ہوگی مگر تہذیبی اور سیاسی ضرورتوں کی بنا پر اس نے کھڑی بولی کی کوئی بھی شکل (اردو یا ہندی) قبول کر لی۔ یا تعلیمی نظام نے ہر علاقے میں زبان کی ان ہی دو شکلوں بلکہ زیادہ تر تو صرف ایک شکل (ہندی) کی ہی اجازت دی جس کی بنا پر ہر شخص کسی ایک ٹوٹی پھوٹی زبان کو اپنی مادری زبان کہتا اور لکھتا ہے جب کہ اس سے اس کا تعلق اس کے فطری ماحول کے مطابق نہیں ہے۔

جس طرح انگریزی ذریعہ تعلیم کے نام پر ہزار ہا اسکول جو گلی گلی اُگ رہے ہیں وہ زبان کا ایک نیا ہی روپ دکھاتے ہیں۔ جو ان اسکولوں میں پڑھتے ہیں ان بچوں کے ماں باپ یا گھر والے تو انگریزی کے پاس سے بھی ہو کر نہیں گزرے مگر وہ تین سال کی عمر سے کسی نام کے انگریزی اسکول کی زد میں آ کر اپنے گھر، ماحول یا ماں کی زبان کے ساتھ ایک حقارت کا رشتہ قائم کر لیتے ہیں اور نفسیاتی طور پر، انگریزی کا دم بھرنا، ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی شروع کر دیتے ہیں۔ معمولی انگریزی اسکولوں کو تو جانے دیجیے بڑے نامی گرامی انگریزی مدارس کے فارغ طلبہ جو عموماً بڑے شہروں یا پہاڑی مقامات پر امیروں کے لیے انگریزوں نے قائم کیے تھے آج پہلے کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہیں۔ ان اسکولوں کے سامنے بھی زبان اور تعلیم و تربیت کا مقصد منصب اور اعلیٰ آمدنی حاصل کرنے والے طبقے میں شامل ہونا ہے۔ اور آج والدین خواہ کسی طبقے کے ہوں زندگی کی پونجی لگا کر اپنے بچوں کو ایسے ہی اسکولوں میں بھیجنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ اب ان کی زبان سنئے تو بیشتر وہ انگریزی کی ہندوستانی شکل استعمال کرتے ہیں۔ اور جو ٹوٹی پھوٹی زبان بازاروں گلیوں یا اپنے گھر کے ملازموں کے ساتھ وہ استعمال کرتے ہیں وہ کسی بھی لسانی معیار پر

پوری نہیں اترتی۔ یعنی ہماری مادری زبانیں کچھ ناخلف قسم کی زبانوں کی زد میں آچکی ہیں۔ اور یہ عمل اتنی تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے کہ آنے والے دور میں ہمارے ملک کی تہذیب پر اس کا کیا اثر پڑے گا اس کا محض قیاس کیا جا سکتا ہے۔ وہ تہذیب کتنی بے رنگ روپ بلکہ بھیانک ہوگی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

دوسرا سوال، ملک کے اندر یا باہر منتقل ہونے والی آبادی کا ہے۔ اس سلسلے میں جعفر حسن صاحب نے حیدرآباد میں منتقل ہونے والے یوپی کے خاندانوں کی دلچسپ مثالیں دی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''حیدرآباد میں نہ صرف عوام بلکہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگوں کی قابل لحاظ تعداد 'خ' کی بجائے 'ق' اور 'ق' کی بجائے 'خ' بولتی ہے۔ دو تین سال ہوئے یہاں ایک مدرسے میں یوم اقبال منایا جارہا تھا۔ ساجی محفل کے پروگرام کا آخری آئیٹم پیش ہونے والا تھا۔ نائب صدر مدرس صاحب نے اعلان فرمایا:

''اب جماعت دہم کے طالب علم خربان علی قاں کی خیادت میں اقبال کا مشہور ترانہ سنایا جائے گا:

از قواب گراں قواب گراں قواب گراں خیز

تمام اصلی ملکی اطمینان سے اقبال کا ترانہ سن رہے تھے بعض وجد کر رہے تھے۔ اس محفل میں بدقسمتی سے دو چار غیر ملکی اور زبان داں تھے انہیں سخت کوفت اور الجھن ہو رہی تھی ان میں سے ایک نے صدر مدرس سے بعد میں کہا:

'' آپ کو کیا سوجھی تھی جو یہ ترانہ نو آموزوں سے پڑھوایا''

جواب ملا۔'' کیا قوب''

نراس ہو کر معترض خاموش ہو گئے۔

یوں تو ہے یہ لطیفہ مگر زبان اپنے علاقے سے نکل کر جب باہر پھیلتی ہے تو وہ بعض ایسے مسائل سے دوچار ہوتی ہے جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان ہندوستان اور پاکستان کے ہر گوشے میں پہنچی ہے اور اہل زبان کی ناگواری کے باوجود وہ نہ صرف مقبول ہوئی بلکہ اردو علاقے

کے باہر وہ بڑے بڑے ادیب و شاعر ہوئے جن کے بغیر تو ہم اردو زبان و ادب کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں نام گنانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ لطائف تو اقبال کے بارے میں بھی بہت مشہور ہوئے مگر اقبال کے بغیر بیسویں صدی کی اردو شاعری کا کوئی ذکر بھی کیا جا سکتا ہے؟ اردو زبان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ وہ اپنے علاقے سے نکل کر دوسرے لسانی علاقوں میں مقبول ہوئی۔ مختلف زبانوں سے رابطے کی بنا پر نئے الفاظ، محاورے اور لہجے آئے۔ ساتھ ہی ساتھ اردو کی روایتی معیار پسندی نے انجذاب کے اس عمل کو قابو میں رکھتے ہوئے منضبط بھی کیا ہے یہ عمل نئی فضاؤں پر پھیلنے والی زبان کے لیے قدرتی طور پر توسیع کا عمل ہے جس کی جڑیں تہذیبی تقاضوں میں ہیں اس لیے اسے روکا نہیں جا سکتا۔

اس سے وابستہ ایک مسئلہ بیرونی ممالک میں اردو آبادی کا ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں رسل و رسائل کی سہولتوں اور بہتر پیشہ ورانہ زندگی اور تازہ واقفیت کی خواہش کی بدولت آبادی کے منتقل ہونے کا جو سلسلہ جاری ہوا اُس کے نتیجے میں لسانی گروہوں کے لیے نئے نئے مسائل پیدا ہوئے۔

یورپ، امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا اور جنوبی ایشیا میں رہنے والے ہندوستانی جو زبان یہاں سے لے کر گئے اُن کے بچے اس زبان سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ نئے ملکوں کی تہذیبی تعلیمی معاشی ضرورتوں کے درمیان یہ لازم ہے۔ ساتھ ہی ساتھ والدین کو اب یہ غم زیادہ سے زیادہ ستانے لگا ہے کہ اُن کے بچے ان کی زبان و ادب سے دور ہو گئے ہیں۔ پچاس سال پہلے یہ مسئلہ اس لیے نہیں تھا کہ زیادہ تر لوگ مستقل طور پر آباد ہونے کے لیے بیرونی ممالک میں نہیں جاتے تھے اور جو جاتے تھے انہیں وہاں کی تہذیب کے اپنا لینے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر گذشتہ برسوں میں تہذیبی تصادم بھی ظہور میں آ گیا ہے، جب یورپ اور امریکہ میں ایشیا اور افریقہ کے لوگ بڑی تعداد میں نہیں تھے تو انہیں خوش آمدید بھی کہا جاتا تھا کہ وہ اُن کی صنعتوں، مشینوں اور دفتروں میں سستے داموں میں کام کرتے تھے۔ اور اپنے حقوق کے لیے مطالبہ بھی نہیں کرتے تھے کیونکہ تعداد اور قوت میں کم تھے۔ آج صورتِ حال مختلف ہے۔ چنانچہ نسلی منافرت اور تشدد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اب اردو والے اس ماحول میں اپنی بستیاں الگ بناتے ہوئے اپنی تہذیب اور زبان کی حفاظت بھی کرنا چاہتے ہیں اور نئے ملکوں کی ترقیات سے بھی پورا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس کشمکش میں بے شمار تہذیبی مسائل کے ساتھ زبان کا بھی مسئلہ نمایاں ہوا ہے۔ بہت سے ملکوں میں

اردو تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ انگلستان جیسے ممالک میں تو حکومت کا تعاون بھی شامل ہوتا ہے۔ اردو والے اپنی تہذیبی شناخت کو قائم رکھنے کے لیے مشاعرے سیمنار اور افسانے کی محفلیں سجاتے ہیں جن میں ہندوستان اور پاکستان کے شاعر اور ادیب بڑی سے بڑی تعداد میں مدعو ہوتے ہیں۔ اُن ملکوں سے اردو کے رسائل اور اخبار بھی شائع ہوتے ہیں اور ہر سال نئی نئی کتابیں بھی شائع ہونے لگی ہیں۔ اپنی الگ شناخت رکھنے کی یہ کوشش اس تہذیبی دباؤ کو مکمل طور پر روک نہیں سکتی جو اس پر نئے خطوں میں لازم ہے۔ چنانچہ دونوں کے درمیان کسی نہ کسی قسم کی مفاہمت لازم ہے خواہ اس میں کتنا ہی زمانہ گزر جائے۔ تہذیبی منافرت اور علیحدگی پسندگی جو بدقسمتی سے بڑھتی جارہی ہے اسی قدرتی مفاہمت سے ہی کم ہوگی۔

یہ مجبوریت، زبان کے لیے فائدہ مند ہے۔ اگرچہ اس کے فروغ کے ساتھ زبان کے صدیوں پرانے معیاروں پر 'ضرب' تو آئے گی مگر یہ دراصل ضرب نہیں بلکہ نئے عناصر کے انجذاب کا قدرتی عمل ہے۔

اردو کا اپنے علاقے سے نکل کر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اور پھر باہر کے ملکوں میں قائم رہنا اس اعتبار سے بھی اس کے لیے اچھا ثابت ہوا کہ اگر وہ صرف یو پی کی علاقائی زبان ہوتی تو آزادی کے بعد کی سرکاری حکمت عملی نے اُسے گلا گھونٹ کر اب تک کب کا ختم کر دیا ہوتا۔ مگر تاریخی تقاضوں کے زیر اثر ظہور میں آنے والے تہذیبی عناصر اپنی قوت پر اسی طرح پھیلتے اور فروغ پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب اردو کے مخالف بھی اس قدر کھل کے اس کی مخالفت کرنے سے بچتے ہیں جیسے آزادی کے فوراً بعد کے کچھ عرصے میں کرتے تھے۔

جعفر حسن صاحب کا خیال اس سے مختلف تھا۔ انہوں نے لکھا:

> ''شستہ اور شائستہ اردو کا مرکز موجودہ اور پچھلی صدی کی طرح دوآبہ تھا اور ہے۔ اگر اس علاقے سے تمام اردو بولنے والے چلے جائیں تو پھر اردو نہیں رہے گی...... مسلمانوں کی عام فلاح اور تہذیبی یادگاروں کے بچاؤ کے قطع نظر اردو کی حفاظت کے لیے بھی مسلمانوں کا یو پی میں رہنا ضروری ہے۔ یو پی کو خیر باد کہہ کر اردو زبان کہیں بھی معراج کو نہیں پہنچ سکتی۔ نہ اجتماعی طور پر نہ انفرادی طور پر۔''

اس بیان میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر زبان کا ایک مرکز ہوتا ہے اور زبان کے معیار اُسی مرکزی علاقے کے چلن کے مطابق طے ہوتے ہیں۔ اردو نے دہلی اور اس کے نواح میں جنم لیا اور وہاں سے نکل کر سارے دوآبے اور پھر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلی۔ ٹکسالی زبان کا اگر کوئی تصور ہو سکتا ہے تو وہ دہلی کی زبان کا تھا۔ دہلی کے شرفاء کی ایک بڑی آبادی لکھنؤ منتقل ہوئی تو انہوں نے اس زبان کو وہاں آزادانہ طور پر فروغ دیا اور لکھنؤ کی زبان بھی معیاری زبان مانی جانے لگی۔ مگر یہ تاریخ کا صرف ایک پہلو ہے۔ زبان فروغ پا کر جب ملک کے دوسرے صوبوں میں پہنچی تو مدتوں تک دہلی اور لکھنؤ کے معیاروں کی پابندی ہوتی رہی۔ اور یہ معیار عموماً اساتذہ کی شاعری پر مبنی تھے۔ بیسویں صدی میں اردو کے مراکز لاہور جیسے شہروں میں بنے اور اس کا بڑا ادب دراصل پنجاب کا مرہون منت ہے۔ سنیما کے فروغ کی بدولت بمبئی بھی اردو کا مرکز بن گیا۔ حیدرآباد، رامپور جیسے علاقوں میں جہاں اردو ادب دربار کا مرہون منت تھا زیادہ تر کلاسیکی روایت کا پابند رہا۔ لیکن لاہور اور بمبئی میں اساتذہ کی پیروی کے باوجود انحراف بھی نظر آتا اور یہ انحراف کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا۔ اب صورتِ حال بہت مختلف ہے۔ ہندوستان کے ایسے علاقوں سے اردو زبان کا ادب شائع ہو رہا ہے جو نہ صرف لکھنؤ اور دہلی سے بہت دور ہیں بلکہ اب اساتذہ کی پیروی اور ٹکسالی زبان کی سند کا رویہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ جب کہ اردو کا چلن پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھ گیا ہے۔ ہندوستان سے باہر بھی کے مختلف علاقوں کے جو لوگ جا کر بس گئے ہیں اُن کی تخلیقات میں اُن کے علاقائی رشتوں کا اثر گہرا ہے۔ پھر جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ یوپی اور دوآبے میں سرکاری پالیسی کی بنا پر اردو کا جو حشر ہوا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب دوآبے سے باہر اردو کو زیادہ آسانیاں ہیں۔ دوآبے میں مدتوں کی جدوجہد کے بعد دوسری زبان کے طور پر اردو کو مانا گیا ہے مگر کسی زمانے کی پہلی زبان کا اس کے بولنے والوں کی طرف سے اسے دوسری زبان کی حیثیت سے قبول کر لینے پر راضی ہو جانا اور وہ بھی محض اعلان ناموں کی حد تک خود اردو زبان کا المیہ ہے۔

جہاں تک ''مسلمانوں کی فلاح اور تہذیبی یادگاروں کے بچاؤ'' کا تعلق ہے تو ہم سب اب اپنے مشاہدے اور تجربے کو کیسے نظرانداز کر سکتے ہیں! آج یوپی کے مسلمان گھرانوں میں ہندی کا چلن عام ہے۔ اردو رسمِ خط کم سے کم نوجوانوں نے سیکھا ہے۔ ش ق اور محاورے سب ماضی کی

یادگار ہوتے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے فلاح اور تہذیبی یادگاروں کے بچاؤ کے معاملے سے اردو زبان خاصی الگ ہو چکی ہے اگر چہ جذباتی طور پر ہم اس حقیقت کو شاید ماننے کے لیے تیار نہ ہوں۔

مضمون میں زبان کے الفاظ اور محاوروں کے سلسلے میں نہایت فاضلانہ بحث کی گئی ہے اور اس حقیقت کو نہایت خوبی سے اُجاگر کیا گیا ہے کہ زبان ہمیشہ اپنے بولنے والوں کے سماج اور تہذیب کا اشاریہ ہوتی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اخلاقی، معاشرتی، مجلسی رویے بھی زبان کے مختلف پہلوؤں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور زبان بولنے والے گروہوں کی ذہنی ساخت میں ان اقدار کا گہرا اثر ہوتا ہے جو انہوں نے بچپن سے الفاظ کے ذریعے قبول کیا ہے۔ چنانچہ اردو تہذیب کے سلسلے میں جعفر حسن صاحب نے نہایت دلچسپ اہم اور معنی خیز بحث کی ہے۔ مگر انہوں نے تہذیب و زبان کے اثرات پر جتنا زور دیا ہے اس سے یہ حقیقت پس پشت نظر آنے لگتی ہے کہ دراصل بنیادی طور سماج ہی زبان کو جنم دیتا ہے۔ اور سماج کی تبدیلیاں زبان کو بھی متحرک کر دیتی ہیں۔ چنانچہ آج اگر بہت سے پرانے الفاظ ہمیں اجنبی نظر آتے ہیں یا ہم اپنے بزرگوں سے یہ سنتے ہیں کہ آج کے لڑکے اردو زبان کیا جانیں تو ہم اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ زبان سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کی تابع ہے۔ مثال کے طور پر آج مساوات کے تصور نے بہت سے ایسے الفاظ جو پرانی تہذیبی درجہ بندی کے سبب وجود میں آئے تھے زبان سے تقریباً خارج ہو چکے ہیں۔ مثلاً آج کسی کو اچھوت، دہقانی، یا نیچ گنوار کہنے کا چلن ختم ہو چکا ہے۔ غالبؔ نے تو اہل حرفہ کو سماج کے نچلے طبقے میں شمار کرتے تھے جب کہ آج اہل حرفہ سے ذہن ادھر منتقل نہیں ہوگا بلکہ اس سے شاید آج کے زیادہ خوش حال اور متمول طبقے کا خیال آئے گا۔

لفظ و معنی کی بحث میں جعفر حسن صاحب نے جو باتیں کہی ہیں وہ آج کے نقطۂ نظر سے مطابقت رکھتی ہیں مثلاً یقین کے ساتھ لفظوں کے معنی بتانا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ ہر چیز کے معنی و مطلب محض اضافی ہیں۔

سماج پر ادب کے اثرات کے سلسلے میں جعفر حسن صاحب اس نظریے کی پیروی کرتے ہیں جو ان کے زمانے میں عام تھا:

> ''ترقی پسند، حوصلہ مند اور بلند نظر ادب قوم کو جاندار ترقی پسند حوصلہ مند اور بلند نظر بناتا یا بنانے میں مدد دیتا ہے۔ ادب اگر زوالی ہو، تنگ نظر ہو، دکھ

پسندی، ندامت اور جہالت کی طرف لے جانے والا ہو تو وہ اس سے وابستہ لوگوں کو اور زیادہ تباہ کرتا ہے بلکہ لے ڈوبتا ہے۔ ترقی اور تنزل میں ادب کا دخل ہے۔ سماج سازی اور اجتماعی ذہنیت کی پیدائش اور تسلسل میں اس کی اہمیت نا قابلِ انکار ہے''۔

بیان غلط نہیں مگر ادھوری سچائی پر مبنی ہے۔ خصوصاً پہلا فقرہ دیکھیے اور یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ ''ترقی پسند حوصلہ منداور بلند نظر ادب'' تو اردو میں اس صدی میں بہت بڑا ہوا مگر اس نے اردو بولنے والوں کو کتنا جاندار ترقی پسند، حوصلہ منداور بلند نظر بنایا یا مدد کی۔

جعفرحسن صاحب کے مضمون میں ایک خاص بات ان کا املا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اردو املا بہت پیچیدہ ہے اور الفاظ کو اسی طرح لکھنا چاہیے جیسے کہ وہ بولے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اپنا یہی املا استعمال کیا۔ چنانچہ اس مضمون میں بھی ایسے الفاظ نظر آئیں گے۔

بلکل، خُد بخش وغیرہ

جعفرحسن صاحب کا یہ مضمون نہایت دلچسپ اور مفید ہے اور لازم ہے کہ ہم ان کی باتوں پر آج کے تناظر میں غور کریں۔ بزرگوں نے جو کچھ ہمارے لیے اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہ اثاثہ معمولی نہیں۔ بہت سی قابلِ قدر باتیں ہیں جن پر بدلتے ہوئے حالات میں از سرِ نو غور کرنا لازم ہے۔ وہ لوگ ان حالات سے دوچار نہیں تھے جن میں ہم ہیں۔ چنانچہ وہ سب کچھ جو وہ کہہ گئے وہ اہم قابل غور اور قابلِ احترام ہونے کے باوجود حرفِ آخر نہیں۔ اس پر تمام تر انکساری کے ساتھ سرے سے غور کرنا ہی ان کی روایات کو آگے بڑھانا ہے۔

☆☆☆

اُردو رسم خط

ہندوستان میں یورپ کے لوگوں کے آنے سے پہلے اردو رسم خط اور املا کا کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں۔ یہ مسئلہ دراصل اس وقت اٹھا جب ان لوگوں نے اور خصوصاً جان گل کرسٹ نے اردو زبان خود پڑھنے کی اور اپنے ہم وطنوں کو پڑھانے کی طرف توجہ دی۔ اس سے پہلے اردو لکھنے پڑھنے والے لوگ صرف وہی تھے جن کے ذہن و نگاہ اور قلم کی تربیت ہی اس رسم خط کے نظام کے ساتھ ہوئی تھی۔ گلکرسٹ جیسے لوگوں کی کوششوں کی بدولت جب فورٹ ولیم کالج وجود میں آیا تو انھوں نے اس مسئلے کو حل کرنے کی بھی کوشش کی جس سے انھیں سابقہ پڑا تھا۔

کسی زبان کا چلن عموماً تین بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ ایک تو روایت، دوسرے منطق اور تیسرے سہولت۔ روایت اور منطق کے درمیان عموماً کشاکش رہتی ہے اور سہولت کا وزن کبھی روایت کے پلے کو بھاری کرتا ہے اور کبھی منطق کو۔ جدھر سہولت کا زور ہوتا ہے فیصلہ اس کے حق میں ہوتا ہے اور وہی زبان کا چلن بن جاتا ہے۔ غیر ملکیوں کے لئے زبان سیکھنے کے عمل میں منطق زیادہ اہم ہوتی ہے اور منطق بھی وہ جو ان کی اپنی مادری زبان پر مبنی ہو۔ چنانچہ انگریزوں کو اردو پڑھانے کے اپنے اصول جو ان پر اس زبان کو سہل کردیں۔ انگریزوں میں زبان کی گرامر، رسم خط انداز تحریر وغیرہ کی بنیاد پر وضع کیے گئے ۔ انگریز جس تحریر کو پڑھنے کے عادی تھے وہ بائیں سے دائیں کو لکھی جاتی تھی۔ آوازوں کی علامتیں اپنی شکل کے اعتبار سے کوئی مشابہت ہماری صوتی علامتوں سے نہیں رکھتی تھیں۔ پھر بعض آوازیں تو ان کی زبان میں تھیں ہی نہیں۔ چناں چہ ایک نیا رسم خط سکھانے کی پہلی منزل گل کرسٹ نے رومن رسم خط کو قرار دیا۔ اس نے اردو کی آوازوں کو

رومن رسم خط میں اس طرح Alphabet میں اضافی نشانات کے ذریعہ پیش کیا مثلاً ز ذ، ض، ظ کے لیے محض z کو کافی نہ جان کر z کو ہی چار امتیازی صورتوں میں پیش کیا جائے۔ گل کرسٹ نے اپنے اس طریق کار پر اصرار کیا اور اس حد تک اصرار کیا کہ بڑی تلخ بحثیں بھی ہوئیں۔ مگر گل گلکرسٹ کا کہنا تھا کہ جس طرح اردو رسم خط سیکھنا آسان ہو جائے گا کیونکہ رومن رسم خط کے ذریعے جس سے طالب علم پہلے سے آشنا تھے وہ پہلے اردو آوازوں اور علامتوں کے امتیازات سے اچھی طرح واقف ہو جائے گا جبکہ اسے زبان آجائے گی تو رسم خط سیکھنے میں اسے اچانک بہت سارے پیچیدہ مراحل کو ایک ساتھ طے نہ کرنا پڑے گا۔ دراصل ہندوستانی زبانوں کا یہ Romanisation سارے یورپی لوگوں کے لیے ایک لازمہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بغیر وہ زبان سیکھنے کی ابتدائی منزلیں طے نہیں کر سکتے تھے۔ گل کرسٹ سے پہلے متعدد یوروپی افراد نے اپنے اپنے طور پر Roman رسم خط کے ذریعہ ہندوستانی زبان سیکھنے اور سکھانے کی کوششیں کیں مگر عموماً ان کی توجہ سرسری رہی۔ سب سے پہلے سرولیم جونز نے ایک ایسا رومن خط وضع کیا! جس میں عربی، فارسی اور سنسکرت اور دوسری زبانیں بھی سما سکتی تھیں۔ انیسویں صدی میں Romanisation کے انداز جاری رہے۔ ایک ولیم جونس اور دوسرے گلکرسٹ کا۔

گلکرسٹ کا مقصد ایک ایسی تدریسی منزل اور نفسیاتی وسیلے کے طور پر استعمال کرنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح سیکھنے والوں میں ایک تحیّر کا مادّہ بیدار ہوگا اور اردو رسم خط کے نظام اور اس کی پیچیدگیوں سے ایک مانوس وسیلے کے ذریعے آشنا ہو جائے گا۔ اور دھیرے دھیرے اردو رسم خط کو سیکھنے کی خواہش جاگے گی، اس وقت زبان کی مجموعی تدریس کو بامقصد منطقی طور پر بامعنی اور منظم بنانا تھا۔

گل کرسٹ اپنے مجوزہ Roman رسم خط میں برابر ترمیم واصلاح کرتا رہا اور بالآخر اپنی ایک کتاب Dialogues میں اس نے جو رومن رسم خط استعمال کیا وہ اس کے اپنائے ہوئے طریقوں میں سب سے زیادہ مکمل تھا۔ اس نے اس کی صحت کا ثبوت دینے کے لیے ایک ہی کہانی کو کئی مشرقی زبانوں میں (اردو، ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی) میں لکھ کر دکھایا، گل کرسٹ کا مجوزہ رسم خط ولیم جونز کے تجویز کردہ رسم خط سے بہت قریب تھا۔ گل کرسٹ کی اس اسکیم میں چند خامیاں تھیں۔

(۱) علامتوں کی کل تعداد بہت زیادہ تھی جنہیں بہ آسانی کم کیا جا سکتا تھا۔ (۴۸ علامتیں)

(۲) یہ رومن رسم خط صرف انگریزی داں یورپی باشندوں کے کام آ سکتا تھا۔ اوروں کے لئے مشکل تھا۔ کیوں کہ وہ Latin system سے عموماً واقف ہوتے تھے جس پر ولیم جونز نے تکیہ کیا تھا اور اس لئے وہ زیادہ قابل قبول ہوا۔ یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ گل گرسٹ کا مقصد متبادل رسم خط پیش کرنا نہیں بلکہ معاون رسم خط پیش کرنا تھا۔ اس اعتبار سے اس کا استعمال اور فائدہ بھی محدود تھا یہ طرز پیچیدہ ضرور تھا مگر ایسا ہونا لازم تھا۔ یہ اس مقصد سے وضع کیا گیا تھا کہ ایک رسم خط کی ساری پیچیدگیوں کو ختم کرنے کی بجائے سہل بنا کر ان سے آشنا کرایا جائے اور نفسیاتی طور پر ان کو عادی کردے جو اسے سیکھنا چاہتے ہیں۔ مستشرقین نے رومن رسم خط کو اس وجہ سے اختیار کیا تھا کہ وہ اس کے ذریعے مشرقی زبانوں کے علمی ادبی ذخیرے اور اصطلاحات میں چند مخصوص آوازوں سے یورپ والوں کو واقف کرا سکیں جب کہ گل گرسٹ کا تمام تر مقصد ایسا وسیلۂ تدریس اختیار کرنا تھا جس سے اردو رسم خط سیکھنا آسان ہو جائے۔ گل گرسٹ اور فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی میں اردو رسم خط سکھانے کی ایک منزل تھی اس کے بعد کی منزل اردو رسم خط میں لکھنا اور پڑھنا سکھانا تھا اور ان لوگوں کو سکھانا تھا جن کی مادری زبان اردو نہ تھی اور جن کی نگاہیں اس رسم خط کے مروجہ نظام سے واقف نہ تھیں کیوں کہ اس وقت تک اردو تحریر خطاطوں اور کاتبوں کی دست نگر تھی اور خطاطی ایک آرٹ تھا جس میں خطاط اپنے جمالیاتی ذوق کے مطابق ندرتیں، نزاکتیں اور باریکیاں پیدا کرتے تھے۔ جو آج تک ہمارے ماضی کا دلکش اور شاندار یادگار

ہیں۔ مگر کتابوں کی نقل اور مسودات کی ترتیب میں بسا اوقات ماہرین فن کی جگہ معمولی استعداد کے لوگ بھی لے لیتے تھے۔ بلکہ تعداد میں ایسے کاتب آج کی طرح اس وقت بھی زیادہ تھے۔ ان کی تحریروں میں زبان کی صوتی منطق سے زیادہ حسن آفرینی کا رجحان تھا چنانچہ ایک ہی تلفظ کے مختلف حرفوں کو ایک دوسرے سے بدل دینا، کہیں کہیں حرفوں کی صوتی ترتیب کو بھی نظر انداز کر دینا، نقطے کہیں کم اور کہیں بالکل غائب کر دینا یا رکھنے کی غرض سے ایک حرف کا نقطہ کسی دوسرے حرف کے ساتھ رکھ دینا۔ کوزی آوازوں کی علامتیں اڑا دینا ک اور گ دونوں میں ایک ہی مرکز سے کام چلانا یہ سب باتیں عام تھیں۔ عربی، فارسی اور اردو پڑھنے والے تحریر کے اس نظام سے آشنا تھے کیونکہ صدیوں سے ان کی تربیت کسی کے ساتھ ہوئی تھی مگر یورپ سے آنے والے لوگ اس کا مذاق نہ رکھتے تھے وہ ایک قطعاً مختلف رسم خط اور اس کے نظام کے عادی تھے۔ چناں چہ انہیں ایک نئی زبان کے ساتھ نئے رسم خط اور انداز تحریر سے آشنا ہونے کے لیے لازم تھا کہ وہ اس رسم خط کی صوتی منطق کو سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ بھی جانیں کہ ہر زبان کی طرح ہماری زبان میں منطق استعمال سے کس طرح اور کہاں احتراز کیا گیا تھا، چنانچہ انھوں نے جب ہمارے رسم خط کے سیکھنے اور سکھانے کی طرف توجہ کی تو انھیں تحریر اور املا کو اس کے منطقی نظام کے ساتھ لکھنا پڑا کیونکہ کوئی ایسا ضابطہ نہ تھا جسے یکساں طور پر مانا جاتا ہو۔ خطاطی ایک فن تھا جس میں خطاط اپنی انفرادیت کا مظاہرہ کرتے تھے اور حسن آفرینی سب سے اہم مقصد تھا۔ اردو داں حضرات کے مزاج اور نظروں کی تربیت تحریر کے اسی رواج کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہوئی تھی۔ چنانچہ ان کے لیے اس میں کوئی دقت نہ تھی مگر مغرب سے آئے ہوئے ان لوگوں کے لیے جو اس سے سراسر ناواقف تھے اور جن کی نظر میں ان کے اپنے رسم خط کی سُدھائی ہوئی تھیں۔ ان کے لیے اس سے لطف اندوز ہونا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ وہ تحریر کے خم و پیچ کی حسن آفرینی سے زیادہ تحریر کی افادیت کی بنا پر اسے سکھانا چاہتے تھے۔ ان کو اور بھی بہت سی چیزیں سیکھنی تھیں۔ اس لیے ان کے پاس وقت بھی کم تھا چنانچہ اردو تحریر کو ان کی خاطر آسان بنانے کے لیے کسی نہ کسی قسم کے ایسے اصولوں اور ضابطوں کے تحت لانا لازم تھا جن میں یکسانیت اور نظم ہو، بے ترتیبی اور بے ضابطگی نہ ہو۔

تیسری اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ فورٹ ولیم کالج کی درسی کتابیں طباعت کی منزل سے گزرتی تھیں۔ اور طباعت کے لئے بھی لیتھو وغیرہ نہیں بلکہ نستعلیق ٹائپ کے حروف وضع کرنے تھے۔ یعنی اردو رسم خط کو مشینی ضابطوں کے مطابق ہونا تھا۔ ہاتھ کے ڈھلے ہوئے ٹائپ کے حروف ان گنت اور من مانی شکلوں میں نہیں ہو سکتے تھے کی صرف ممکن اور قابل استعمال شکلیں وضع کی جا سکتی تھیں، اور ان کے ساتھ یہ بھی وضاحت لازم تھی کہ حرف کی کون سی صورت کب اور کس طرح استعمال ہو۔ مثلاً لفظ کے شروع، آخر اور درمیان میں آنے والے حرف کی شکل کیا ہو، نقطے کہاں ہوں، جوڑ کیسے ملائے جائیں اور آدھے حروف اور پورے حروف کس طرح ملائے جائیں۔ یعنی یہاں انفرادی مذاق تحریر نہیں بلکہ پریس کا ضابطہ تھا اور جو اسے سیکھ سکتا تھا وہی طباعت کا کام بھی کر سکتا تھا۔ چناں چہ اردو تحریر اور املا کو طباعت کی ضرورتوں کے مطابق نظم وضبط سے آشنا کرنا ہی لازم تھا۔ چناں چہ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں اردو رسم خط اور املا ان ہی حد بندیوں کی بدولت اس طرح سے وجود میں آیا جیسا کہ ہمیں ملتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج سے شائع ہونے والی کتابیں خوبصورت نستعلیق ٹائپ میں چھپتی تھیں۔ یہاں املا اور اعراب واو قاف کے ضابطے کی عموماً پابندی کی گئی۔ کالج کی کتابوں میں مندرجہ ذیل خصوصیات ملتی ہیں جو اس سے پہلے بلکہ اس کے بعد بھی اس وقت تک جاری رہیں جب تک انجمن ترقی اردو نے ان کی ضابطہ بندی نہیں کی۔

(۱) مصوتوں میں امتیاز کرنے کے لیے واضح علامتیں ی اور ے پر لگائی گئی ہیں۔

(۲) دو چشمی ھ اور ہائے ہوز کے استعمال کا ضابطہ متعین کر دیا گیا۔ دو چشمی ھ صرف ھ کا aspirated آواز میں لکھی گئی۔

(۳) نون اور نون غنہ میں امتیاز کرنے کے لئے نون غنہ پر سے نقطہ ہٹا دیا گیا۔

(۴) کوزی آوازوں (Retroflex) کی نشان دہی کے لیے علامتیں متعین کر دی گئیں۔

ٹ کے لیے ت پر ایک خط کھینچ دیا گیا اور ڈ اور ڑ کے لیے اور پر صرف ایک خط کافی سمجھا گیا۔

(۵) بعض الفاظ کا املا آج سے مختلف ہے مثلاً لمبا 'م' کے ساتھ لکھتے ہیں،

فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں یہ نون کے ساتھ ہے لنبا۔ اسی طرح
ردیہ میں یے کے بعد وہاں الف ہے اور معلیٰ میں لام الف نہ کہ یے کہ
اوپر کھڑا زبر ہے۔

(۶) لفظوں کو ملا کر لکھنے سے احتراز کرنے کی کوشش کی گئی اگر چہ اسے مکمل طور پر ترک نہیں کیا گیا۔

صرف اضافت کی جگہ کا کے کی کو ملا کر لکھنے کا چلن باقی رہا مگر اس کا تعین کر دیا گیا کہ حروف کہاں ملائے جائیں گے، یہاں بھی یکسانیت اور ضابطے ہی کا خیال رکھا گیا۔

(۷) س اور ش کے شوشوں کو ابتدائی صورت میں ہٹا کر لکیر سے کام چلانے کا رجحان ہے جب کہ درمیانی اور آخری صورتوں میں شوشے برقرار رکھے گئے۔

(۸) دوہری آوازوں کی نشاندہی تشدید کے ذریعہ کی گئی۔

(۹) نقطوں کا باقاعدگی کے ساتھ استعمال کیا گیا جس کا رواج نہیں تھا۔

(۱۰) ک اور گ کے فرق کو ظاہر کرنے کے لئے مرکز لگانے میں باقاعدہ احتیاط برتی گئی۔

(۱۱) الف جہاں لفظ کی ابتدا میں Long vovel کی شکل میں آتا ہے۔ وہاں مدلازماً لگایا جانے لگا۔

اس نظام میں کہیں کہیں بے ترتیبی بھی پائی جاتی ہے اگر چہ زیادہ تر اس کی پابندی کی کوشش کی گئی۔ بعض چیزوں کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ مثلاً مصوتوں کی امتیازی خصوصیات متعین کرنے کا جس قدر اہتمام کیا گیا اس کا تقاضہ تھا کہ ''وٗ'' جب مصوتے کی شکل میں آئے تو اس کا اظہار علامت سے ہوتا مگر ایسا نہیں ہے۔ مثلاً رو برو، آوے، کھودے ہووے میں وکا یہ امتیاز نہیں ملتا۔ اسی طرح (E اور A) ای اور اے کی امتیازی علامتوں کو کہیں کہیں نظر انداز کیا گیا۔

ان بے قاعدگیوں کی ایک وجہ تو طباعت کے اہتمام میں بے جانے بوجھے غلطی اور misprint ہو سکتی ہے۔ اور اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نگاہوں کو دھیرے دھیرے

ان امتیازات کو نظر انداز کرنے کا عادی بنایا جائے تا کہ وہ ان کتابوں سے ہٹ کر اردو کی تحریریں پڑھیں تو وہ ہماری اس عام بے ضابطگی سے آشنا ہوں۔ اس کا امکان اس لیے ہے کہ گل کرسٹ نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ ہندوستانیوں اوران کی زبان اور عام عادتوں کی بے ضابطگیوں سے واقف کرنے کی اہمیت پر زور دیا ہے کہ اس سے طالب علم دھیرے دھیرے زبان اور تحریر کی اس صورت سے واقف ہوں جس کا انہیں روزمرہ کی زندگی میں سابقہ پڑے گا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری تاریخ میں فورٹ ولیم کالج نے اردو کی ضابطہ بندی کی طرف سب سے پہلے توجہ کی۔ اور اپنی کتابوں میں اس کا ہر ممکن اہتمام بھی کیا۔ عام طور سے تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ضابطوں کی پابندی کے اعتبار سے سب سے اہم کتاب باغ و بہار کے ۱۸۰۳ کا ایڈیشن ہے جو ہر اعتبار سے فورٹ ولیم کالج کی سب سے نمائندہ کتاب اور تزئین میں بھی دوسری کتابوں پر سبقت رکھتی ہے۔ یہاں اعراب و اوقاف کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔

فورٹ ولیم نے نستعلیق کی پیچیدگیوں ٹائپ کے حروف ڈھالنے کی تکنیکی دقتوں اور طباعت کی جملہ مشکلات کے باوجود نستعلیق کے جس خوبصورت ٹائپ میں کتابیں شائع کیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اگر طباعت کے اس طرز کو فروغ ہوتا تو شاید ہمارے یہاں املا کے ضابطے دوسری زبانوں کی طرح مشینی تکنیک کی جبر کی بدولت خود بخود بہت پہلے متعین ہو جاتے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ طباعت کا یہ انداز کچھ عرصے تک چلا اور وہ بھی محدود رہا۔ اس کے بعد لیتھو کا چلن عام ہوا اور کاتبوں نے کتابت کی بے قاعدگیوں کو جاری رکھا۔ جس کی بدولت آج ہم سب بہت آگے آجانے کے بعد بھی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اردو میں املا کے تعین اور ضابطہ بندی کا کام جس پیمانے پر شروع ہوا تھا اس کی جو کچھ ضرورتیں تھیں وہ نہ رہیں تو یہ کام بھی سست رفتار ہو گیا۔ مگر اب تو کمپیوٹر کا زمانہ آچکا ہے۔ جس نے اردو کتابت و طباعت کو بہت آگے پہنچا دیا اور پرانے مسائل بڑی حد تک حل ہو گئے۔

فورٹ ولیم کالج

یورپ کے لوگوں کا ہندوستان آنا تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا۔ آنے والوں میں سوداگر بھی تھے سیاح بھی اور عیسائی مبلغ بھی۔ ان سب کے سامنے سب سے پہلا اہم مسئلہ یہاں کے لوگوں سے میل جول بڑھانا تھا۔ اور میل جول کا ذریعہ یہاں کی زبانیں ہی ہو سکتی ہیں۔ عیسائی مبلغوں اور سیاحوں نے تو پہلے دن سے ہی ہندوستانی زبانوں کی اہمیت کا اندازہ کر لیا تھا۔ اور تاجر بھی اپنا کام جیسے تیسے چلا لیتے تھے۔ مگر جب یہی تاجر حکمراں بن گئے انھیں اس کا بھی احساس ہوا کہ یہاں کے لوگوں سے محض رابطہ کافی نہیں بلکہ معاملہ بھی کرنا پڑے گا۔ اور اس کے لئے یہاں کی معاشرت، یہاں کے مذاہب یہاں کی تہذیب اور فلسفہ غرض کہ سب ہی کچھ سیکھنا لازم تھا۔ 1757ء میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد جب بنگال پہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعدد افراد نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان میں ایک مستحکم برطانوی سامراج کے قیام کے لئے یہاں کی زبانوں کا سیکھنا ضروری ہے۔ ان لوگوں میں سب سے اہم شخص جان بارتھ وک گل کرسٹ تھا۔ اٹھارھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے برطانوی سامراج اور مضبوط ہو گیا۔ گورنر جنرل ویلزلی نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے اصرار کیا کہ اب سوداگروں کی طرح نہیں بلکہ حکمرانوں کی طرح ایک نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے جس میں فوری منافع خوری کے مقابلے میں سلطنت کے استحکام کو مدنظر رکھا جائے۔ اسی مقصد کے تئیں ویلزلی نے کمپنی کے ارباب حل وعقد کی اجازت کے بغیر فورٹ ولیم کالج قائم کر دیا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ جو انگریز اس وقت کمپنی کی

ملازمت میں ہندوستان آتے تھے۔ وہ سب کم حیثیت خاندانوں سے تعلق رکھنے والے نوعمر لڑکے تھے، جو اپنے ملک میں دوسروں کے مقابلے پر آنہیں سکتے تھے۔ چنانچہ اپنی قسمت آزمانے کے لئے ہندوستان کا رخ کرتے تھے۔ یہاں دولت کی فراوانی اور برطانیہ جیسی حکومت کی سرپرستی کی بدولت ان میں سے اکثر کامیاب ہوتے تھے۔ وہ وطن سے دور ہونے کے سبب بسا اوقات آزاد بلکہ بے لگام بھی ہوجاتے تھے۔ چنانچہ انھیں فورٹ ولیم کالج کی ڈسپلن کا پابند کر کے مروجہ علوم کے علاوہ مشرقی علوم سے آراستہ کرنا ضروری تھا۔ ان کے ذہن و کردار کی ایسی تربیت بھی درکار تھی جو حکمرانوں کے شایان شان ہو۔

چنانچہ 1800ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ یورپ کی اکیڈمیوں کے طرز پر ایک بڑے ادارے کا منصوبہ بنایا گیا جس میں مختلف مشرقی و مغربی علوم کے شعبوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ویلزلی کا پورا منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے مالی وجوہ کی بنا پر رد کردیا تھا۔ کالج یوں تو 1854 تک برائے نام رہا۔ مگر اس کی سرگرمیاں 1820 کے بعد تقریباً ختم ہوگئیں۔ اور ان بیس برسوں میں بھی بس ابتدائی پانچ سال زیادہ اہم ہیں جب ویلزلی گورنر جنرل تھا اور جان گل کرسٹ شعبۂ ہندوستانی کا صدر تھا۔ کالج میں سنسکرت، بنگالی، عربی فارسی کے شعبے بھی بہت اہم تھے۔ مگر سب سے زیادہ سرگرم شعبہ ہندوستانی کا تھا۔ گل کرسٹ کو ادبی مورخوں نے کسی غلط فہمی کی بنا پر کالج کا پرنسپل بھی کہا ہے۔ جو صحیح نہیں۔ شاید اس کی شہرت اور سرگرمی کی بنا پر غلط فہمی ہوئی۔ گل کرسٹ نے فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے اٹھارہ برس اردو زبان کی تعلیم و تدریس اور تحقیق میں صرف کئے تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ زبان مقبول ہونے کے باوجود اعلیٰ ادبی نثر سے محروم ہے۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے منصوبوں میں نثر کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی گئی۔ ایسی کتابیں مرتب کرائی گئیں جو آج بھی ہمارے ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔ فورٹ ولیم سے پہلے اردو میں میرؔ و سوداؔ جیسے شاعر اپنی عظمت کا سکہ جما چکے تھے۔ مگر نثر میں ان کا کوئی پاسنگ بھی نہ تھا۔ ہمارے مصنفین نثر لکھتے بھی تھے تو فارسی میں۔ یہاں تک کہ میرؔ جیسے اردو شاعر نے اپنی آپ بیتی بھی فارسی میں لکھی اور اردو شاعروں کا تذکرہ بھی۔ نثر کی چند کتابیں جو کالج کے قیام سے پہلے لکھی گئی تھیں، ان سے اس زمانے میں بھی کم ہی لوگ واقف تھے۔ اور نو آموز

انگریزوں کے لئے تو یہ کسی کام کی نہ تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج نے اس عہد کے بہترین نثر نگاروں کو دریافت کیا اور ان کو وہ ساری سہولتیں فراہم کیں جو اس ہنگامہ خیز عہد میں ادیبوں کے لئے ناپید ہو چکی تھیں۔ میر امن، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، مرزا علی کاظم علی جوان اور بہت سے دوسرے ادیب کالج میں آنے سے پہلے شاعری کرتے تھے یا فارسی نثر میں کتابیں لکھتے تھے۔ ان کی نثری تخلیقات تالیفات اور تراجم کالج کی ہی مرہون منت ہیں۔ فورٹ ولیم کالج نہ ہوتا تو باغ و بہار، آرایش محفل جیسی کتابیں ظہور میں ہی نہ آتیں۔

فورٹ ولیم کالج کا سب سے بڑا کارنامہ تھا سادہ اور بول چال کی زبان کی ہمت افزائی۔ اس زمانے میں فارسی آمیز نثر کا چلن تھا۔ پر تصنع اور پیچیدہ اسلوب پسند کیا جاتا تھا۔ یہ طرز اعلیٰ اور پڑھے لکھے طبقوں میں تو چل سکتا تھا مگر نو آموزوں کی تعلیم و تدریس کے نقطۂ نظر سے بالکل بیکار تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا حقیقی زندگی سے بس دور کا تعلق تھا۔ حکومت کے دفاتر گلیوں اور بازاروں میں اور عام محفلوں میں وہ نثر ناپید تھی۔ چنانچہ گل کرسٹ کے ایما پر سادہ زبان و اسلوب پر زور دیا گیا۔ اور اس طرز کو مقبول بنانے کی منظم کوشش کی گئی۔

یہ کام اتنا آسان نہ تھا کیونکہ جن مصنفین سے یہ کتابیں لکھوائی جا رہی تھیں انھوں نے خود اس طرح کی نثر پہلے کبھی نہ لکھی تھی۔ ہر چند وہ روزمرہ کے کاموں میں یہی نثر استعمال کرتے تھے۔ کالج کی کتاب ضبط تحریر میں آنے کے بعد کئی لوگوں کی نظروں سے گزرتی تھی۔ دہلی کا ایک قصہ خواں ملازم رکھا گیا تھا تاکہ اسکی زبان سے ہر داستان دلّی کے ٹیٹھ محاورے میں سنی جائے۔ مسودہ کی تصحیح کے وقت اسے مدنظر رکھا جائے۔ غرض کہ فورٹ ولیم کالج نے جس ادبی اسلوب کو مقبول کیا وہ مستقبل میں فروغ پانے والا اسلوب تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی اس نثر کا راست اور فوری اثر نہ ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا حلقۂ اثر نو آموز انگریزوں تک محدود تھا۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کالج کے مصنفین نے اردو نثر کے اپنے فطری اسلوب کے حسن کو سب سے پہلے دریافت کیا۔

طلبہ کی درسی ضرورتوں کے مطابق کتابوں کی تالیف و تدوین کالج کا ایک اور کارنامہ ہے۔ یہ کتابیں اردو کو غیر مادری زبان کے طور پر پڑھانے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ جس کا تجربہ جان

گل کرسٹ برسوں سے کر رہا تھا۔ چنانچہ کتابوں کے ساتھ فرہنگیں، تعارفی حاشیے بھی مرتب کیے گئے تھے۔ اردو میں نصابی کتابوں کا یہ پہلا باضابطہ تجربہ تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کالج نے اس کام کو جس منزل تک پہنچا دیا تھا، ہم نہ صرف اس سے آگے بڑھ سکے بلکہ اتنا بھی ابھی تک نہ کر پائے۔

فورٹ ولیم کالج کی بدولت اردو میں طباعت و اشاعت کا نیا دور شروع ہوا۔ پرنٹنگ پریس تو کالج کے قیام سے پہلے آ چکا تھا مگر اس کا بڑے پیمانے پر استعمال کالج میں ہوا۔ یہاں نہ صرف کالج کے مصنفین کی مرتب کی ہوئی کتابیں طبع ہوئیں بلکہ اردو کے اہم شعراء جیسے سوداؔ، میر حسن کی شعری تصانیف پہلی بار مرتب کر کے چھاپی گئیں۔ اس سے قبل اردو ادب تک صرف ان ہی لوگوں کی رسائی تھی جن کے پاس کتابیں نقل کرنے یا کرانے کی استطاعت تھی۔ اب یہ کتابیں دور دور تک پہنچنے لگیں۔ اور اردو میں طباعت و اشاعت کا کام جاری ہو گیا۔

فورٹ ولیم کالج کی تعلیمی سرگرمیوں اور طباعت کے ضمن میں کچھ اور اہم نتائج نکلے۔ مثال کے طور پر اردو تحریر کی ضابطہ بندی ہوئی جس کی طرف پہلے کبھی توجہ نہ دی گئی تھی۔ معروف و مجہول آوازوں اور بائے ہوز اور دو چشمی ہ میں فرق نہ کرنا، لفظوں کو ملا کر لکھنا، عبارت میں اوقاف کا بالکل استعمال نہ کرنا، اب ہماری پرانی اور مانی ہوئی روایتیں تھیں۔ مگر یہ سب بے ضابطگی درسی کتابوں میں ممکن نہ تھی۔ طلبہ کو اردو رسم خط سکھانے کے وقت تحریر کے کچھ اصول سکھانا لازم تھا۔ چنانچہ اردو املا کی ضابطہ بندی کی طرف سب سے پہلے توجہ فورٹ ولیم کالج میں ہی دی گئی۔ فورٹ ولیم کالج سے جو کتابیں شائع ہوئیں اور آج تک کتب خانوں میں دستیاب ہیں طباعت کے بہترین نمونے ہیں۔ ان تحریروں کو پڑھیے تو پرانی ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابوں کی طرح آپ کو یہ پریشانی نہیں ہوگی کہ جملہ کہاں ختم ہوا۔ پیراگراف کہاں شروع ہوا۔ متن میں اقتباس کہاں ہے۔ کالج کی عطا کی ہوئی اس روایت کو جدید دور میں اپنایا گیا اگرچہ اس کی اس سختی سے پابندی آج بھی نہیں کی جاتی جتنی کہ کالج کی کتابوں میں کی جاتی تھی۔

اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ ہندوستانی زبانوں میں مہارت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ہر سال ایک جلسے میں مضامین پیش کرتے تھے۔ اس موقع پر کلکتہ کے مجاہدین کے علاوہ گورنر جنرل بھی موجود ہوتا تھا۔ اردو میں مضمون نگاری کے اولین نمونے اسی روایت کی بدولت وجود میں آئے۔

ان کو پڑھ کر اس عہد کے نوجوان انگریزوں کے اس رویے کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کی طرف تھا۔

فورٹ ولیم کالج برطانوی سامراج کی ضرورتوں کے مطابق قائم کیا گیا اور وہ ملک گیری کے آلۂ کار کے طور پر استعمال ہوا۔ مگر اس ادارے کی سرگرمیوں کی بدولت ایسے بہت سے عناصر وجود میں آئے جو آئندہ ہندوستان کے عوام کی زندگی میں اہمیت حاصل کرنے والے تھے۔ چنانچہ اس ادارے اور اس سے وابستہ افراد کے چھوڑے ہوئے نقوش و اثرات کو اردو زبان و ادب میں آج تک دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اسکولوں میں اردو ادب کا نصاب

ادب کی تعلیم کا مقصد قوتِ اظہار کی جلا کرنا ہے۔ تسلیم شدہ اقدار کے تحت نئی نسلوں کے ذہن و کردار کی تربیت کرنا اور جمالیاتی احساس کو پروان چڑھانا ہے۔ عمومی اور نظری طور پر ان تینوں مقاصد پر بحث و گفتگو کرنا مشکل نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے کیونکہ ان پر سب کو اتفاق ہوگا۔ مسئلہ پیچیدہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی متعینہ وقت، مقام، افراد اور سماج کے تناظر میں ہم ان کی تفصیلات پر توجہ دینا شروع کرتے ہیں۔ جب یہ متعین شدہ مقاصد اپنی غیر معین شکل میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ یعنی زمانے کی تبدیلیاں، مقامات کا فرق، افراد کا تنوع اور سماج کا تغیر، اظہار، اقدار اور جمالیاتی احساس کے حدود کو متعین بھی کردیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان حدود کو توڑنے کی ضرورت اور امکانات کو بھی فراہم کرتا ہے۔ نصابات کی تشکیل ایک نسل کے لوگ کرتے ہیں اور انکے فائدے یا نقصانات دوسری نسلوں تک پہنچتے ہیں۔ ہر نسل اپنی اقدار پروان چڑھانے اور ان کو محفوظ رکھنے کے لیے تعلیم کا استعمال کرتی ہے اور اسی کے مطابق نصابات بنائے جاتے ہیں۔ مگر جب آنے والا زمانہ اور اس کے ساتھ ابھرنے والی نسل بزرگوں کی توقعات کو پورا نہیں کرتی نہ کرسکتی ہے تو نصابات کی افادیت معرضِ بحث میں آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی نسل بھی اپنے آباواجداد کی توقعات کو پورا نہیں کرسکتی اور نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ توقعات بھی اکثر وقت گزرنے کے ساتھ بے کار اور باطل ہوجاتی ہیں۔ گذشتہ ایک صدی کے اندر تبدیلیوں کی تیز رفتاری، انسانی حقوق کے احساس اور جمہوری آزادیوں کے تصور کے فروغ کی بدولت یہ شعور بھی پیدا ہوا ہے کہ

نصابات میں صدیوں کی تسلیم شدہ قدروں کے تحفظ سے زیادہ آنے والے زمانوں میں ان کی ضرورت کو بھی اہمیت دی جانے لگی۔ مستقبل کے تقاضوں کا اندازہ بھی ہر نسل اپنے شعور کے مطابق ہی کر سکتی ہے۔ اور اسی کے مطابق اپنے بس بھر تعلیمی نصاب کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

اب اردو کے نصابوں کو دیکھیے تو پتا چلتا ہے کہ ان کے پس پشت ہمارے ہاں آئندہ ہونے والی تبدیلیوں کا اندازہ کم سے کم اور اپنے تصورات کے تحفظ کا رجحان زیادہ سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں نصابوں میں تبدیلیوں کی خواہش اور دعووں کے باوجود تبدیلیاں نہ ہو سکیں اور وہی اسباق، وہی مصنفین، وہی موضوعات اپنی پرانی شکل میں بار بار کتابوں میں آتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نصابات نئی نسل کے طلبہ اور اساتذہ دونوں کے ذہن و زندگی سے چشمک کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کتابوں کو پڑھانے میں کسی کو دلچسپی نہیں رہ جاتی۔ جب نصابوں کا یہ حال ہوگا تو امدادی کتابوں کا بھی عالم ظاہر ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں اگر اردو پڑھنے والی نئی نسلیں فلمی، جاسوسی، رومانی اور جنسی ادب کی شکل میں جو کچھ بھی پا جائیں اس سے اپنے مذاق کی تسکین کریں تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک طرح کی خودسوزی ہے جس کا ارتکاب اردو دنیا کی عام پسماندگی کی بدولت بڑھتا جاتا ہے۔ میرے نزدیک اس کا ایک حل یہ ہے کہ ہم آج اپنے نصابوں میں روایتی اسباق کی جگہ جدید اور ہم عصر عہد کے ادب اور جدید اور ہم عصر زبان پر زیادہ زور دیں کہ یہ ہمارے آج کے طالب علموں اور کل آنے والے نوجوانوں کے ذہن و زندگی سے زیادہ قریب ہیں۔ ان ہی کے تحت ان کے فہم و احساس کی تربیت ہوئی ہے اور انھوں نے اپنے اظہار کی صورتیں پائی ہیں۔ ہم نے اس حقیقت کو نظر انداز کیا ہے اس لیے اس طرح کے سوال پیدا ہوتے ہیں کہ طلبہ کو عشق کے موضوع سے کس منزل پر آشنا کرایا جائے۔ اور اس کا حل یہ سمجھا جاتا ہے کہ چوٹی کے کلاسیکی شعراء کی عشقیہ شاعری سے عشق کے عنصر کو نکال کر خود شاعر کی صورت کو مسخ کر دیا جائے یا کلاس روم میں شب ہجر اور شب وصال کو نظریں نیچی کر کے عشقِ حقیقی بنا کر پڑھایا جائے۔ اسی طرح قصیدے میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کا اخلاقی نقطۂ نظر سے جواز فراہم ہی نہیں کیا جا سکتا نہ کلاس میں کورس کے لیے اتنا وقت ہوتا ہے کہ اسکول کی سطح پر اس سماج کا پورا

پس منظر اچھی طرح طلبہ کے ذہن نشیں کرایا جائے جس میں قصیدہ لکھا جاتا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ بہادر شاہ ظفر یا شاہان اودھ کی جو تصویر اردو قصیدوں میں ابھرتی ہے اور جو تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہے اس میں کوئی واسطہ نہیں۔ اسکا حل یہ سمجھا جاتا ہے کہ بس قصیدے کے مشکل الفاظ کے معانی سمجھا کر آگے بڑھ لیا جائے۔ استاد بھی کیا کرے۔ نصاب کی بنا پر مجبور ہے جو کتاب اسے دی گئی ہے وہی پڑھائے گا۔ کلاس روم سے باہر نکل کر دیکھیے تو وہی طالب علم جسے عشقیہ شاعری پڑھانا عمر اور اخلاقیات کے تقاضوں کے خلاف سمجھا جاتا ہے، وہ فلم، .T.V اور ریڈیو کے ذریعے ہی نہیں اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتا ہے وہ کلاسیکی اردو شاعری سے بہت آگے کے مناظر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اس سماجی اور نفسیاتی فضا میں اسے اپنی کلاس کے اسباق اس قابل بھی نہیں لگتے کہ ان کا مضحکہ اڑائے۔ وہ اپنی دنیا الگ بناتا ہے۔ جو ہمارے نصاب کے دائرے سے پرے کی مگر اس کے اپنے عہد کی دنیا ہے ہم جسے مسئلے کا حل سمجھتے ہیں دراصل طلبہ کے لئے ایک نیا مسئلہ ہوتا ہے جسے وہ اپنے طور پر حل کرتے ہیں اور جب ہمارا آمنا سامنا ان کے حاصل کیے ہوئے اس حل سے ہوتا ہے، تو ہم نئی نسل اور اس کی اخلاقیات اور گرتے ہوئے ادبی مذاق کا ماتم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتے۔

اسکول کے طلبہ کے لیے ادب کا نصاب زیادہ تر جدید اور ہم عصر ادب پر مبنی ہونا چاہئے۔ کیونکہ زبان، اظہار موضوع اور زندگی کے رویوں کے اعتبار سے اس کا سابقہ اسی دنیا سے ہے اور آئندہ بھی رہے گا جس میں وہ ادب تخلیق ہوا ہے۔ اقدار، زبان، اظہار، جمالیاتی احساس کی جلا کے نقطۂ نظر سے اس کی زندگی اور جدید ادب میں تضاد کم ہے اور اس میں اسکے مستقبل کی زندگی کے عناصر زیادہ سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ نثر و نظم کی مقبول اصناف کے ساتھ نئی اصناف جو آج کل نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں میں مقبول ہیں، ان کے ذریعے ادب کی تدریس کو زیادہ مفید، دلچسپ اور نتیجہ خیز بنایا جاسکتا ہے۔ کلاسیکی ادب اور اس کے اہم پہلوؤں کو سینئر سیکنڈری اسکول کی سطح پر متعارف کرایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں امدادی کتب کے ذریعے بھی طلبہ میں ادب سے دلچسپی پیدا کرائی جاسکتی ہے۔

گذشتہ چالیس برس میں عالمی سطح سے لے کر ہمارے ملک کی علاقائی سطحوں تک جو

تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا اظہار وانعکاس ہمارے نصابوں میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ اسی وقت ہوسکتا تھا جب وقتاً فوقتاً اردو تعلیم کی صورت حال کا جائزہ لیا جاتا اور حالات کے تقاضوں کے مطابق اس کی اصلاح کی کوشش کی جاتی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ شاید اسی لیے کہ حکومتوں اور اردو کے مخالفوں کے رویے نے اگر ایک طرف اردو کے حقوق کے لیے جدو جہد کے دروازے کھول دیے تو دوسری طرف ہم پر مظلومیت کا احساس بھی طاری کر دیا اور ہم اپنے آپ پر ترس کھانے میں اتنا محو ہو گئے کہ جو کچھ تھوڑا بہت کر سکتے تھے وہ بھی نہ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفوں کی ریشہ دوانیوں کے ساتھ ساتھ ہماری بے توجہی نے بھی اردو کو نقصان پہنچایا۔ خصوصاً اسکولوں میں اردو تعلیم دوسرے مضامین کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ گئی۔ چنانچہ آج جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انگریزی ادب اور ہندی ادب کے طالب علم بارہویں جماعت پاس کرنے کے بعد جو صلاحیتیں حاصل کر لیتے ہیں اردو کے اسی منزل سے گزرنے والے طلبہ عموماً وہاں تک نہیں پہنچتے۔ ہماری نصاب کی کتابیں ابھی تک پرانی ہیں۔ مگر پہلے ان ہی کتابوں سے لوگ جو کچھ حاصل کر لیا کرتے تھے، وہ بھی آج کے طلبہ نہیں کر پاتے۔ طلبہ کے لہجے، تلفظ، املا میں سال بہ سال غلطیاں پہلے کے مقابلے میں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان کی معلومات اور واقفیت کی عام سطح بھی آج کے مقابلے میں کم ہے۔

ان سوالات کے متعدد حلوں میں سے ایک حل یہ بھی ہے کہ ہم اسکولوں میں اردو نصاب کی موجودہ صورت حال پر غور کریں۔ اور یہ دیکھیں کہ آج کی ضرورتوں کے مطابق ہم اپنی درسی کتابوں کو کس طرح بہتر بنا سکتے ہیں۔ جن سے طلبہ میں اظہار کی صلاحیتیں بھی پیدا ہو سکیں۔ اور جن میں ادب کے مطالعے کا رجحان ہو ان کے مذاق کی جلا ہو سکے۔ اسکول کی سطح پر اردو پڑھنے والا ہر طالب علم محض ادیب یا شاعر نہیں ہو سکتا اور نہ سب کو ہونا چاہیے مگر زبان وادب کی تعلیم کے ذریعے اظہار کی قوت کے ساتھ ساتھ اس جمالیاتی حس کو بیدار کیا جانا چاہیے جو ہر شخص میں ہوتی ہے خواہ وہ پیشہ ور ادیب و شاعر نہ ہو سکے۔

آج جب کہ ایک نئی تعلیمی پالیسی کو عمل میں لانے کی تیاری ہو رہی ہے اور سارے ملک میں تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے لوگ مجوزہ پالیسی پر غور و خوض کر رہے ہیں تو لازم ہے کہ اردو کی

اردو لکھنؤ اور پنجاب کے درمیان

بیسویں صدی کے بیشتر بڑے ادیب اور شاعر پنجاب سے اٹھے۔ اقبال، فیض، بیدی، کرشن چند، پطرس، اور ان کے علاوہ اور بھی نام ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر دہلی اور لکھنؤ کے اہل زبان سے ان کی چشمک صحت زبان اور محاورہ روزمرہ کے سلسلے میں ہمیشہ رہی اس سلسلے میں لاہور کے رسالہ 'ساقی' میں محمد حسن عسکری کے ایک مضمون میں پنجاب کی زبان پر اعتراض سے ایک بحث چھڑی اس سلسلہ میں جو مسائل آئے وہ بہت اہم ہیں۔ مگر جس انداز میں یہ باتیں زیر بحث آئی ہیں وہ اس قدر دلچسپ ہے کہ پہلے اس کی داد دے لینے دیجیے۔ جھگڑا صحیح زبان کون سی ہے اور یہ فیصلہ کرنے کا حق کسے ہے۔ عسکری صاحب نے 'ساقی' کا ادارتی مکالمہ 'جھلکیاں' لکھا کرتے تھے۔ اسی مقالے میں انھوں نے لکھا:

> ''میں دیکھتا ہوں کہ یوپی والے تک اپنی زبان بھولے جارہے ہیں۔ اردو محاوروں کی ہیجانی شکلیں زبانوں پر چڑھتی جارہی ہیں۔ بعض لفظوں کا تلفظ تک مثلاً اکھٹا کی بجائے اکٹھا لکھنا بہت عام ہوگیا ہے۔ خیر یوں ہی کیا برا ہے۔ زبان کے معیار بدلتے ہی رہتے ہیں لیکن چاہے میرے پنجابی دوستوں کو (گراں) کیوں نہ گزرے۔ ایک بات مجھے بہت کھٹکتی ہے یعنی

جب پنجاب والے ''نہ ہی'' لکھتے ہیں۔ ''میں
نے جانا ہے'' کو بھی میں قبول کرلوں گا 'نہ ہی' کی
زمانی کیفیت نہیں سمی جاتی......''

اس کے جواب میں مولانا صلاح الدین احمد اپنے رسالے ''ادبی دنیا'' میں ''شمشیر بازان پنجاب'' کی طرف سے محمد حسن عسکری کی دعوتِ مبارزت کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اہل پنجاب کے خنجر و شمشیر خوجی کی قرولی نہیں کہ بات بات پر نیام سے نکل آئیں۔'' اس کے بعد صلاح الدین احمد صاحب لکھتے ہیں کہ اس کے ایک محترم دوست کا مکتوب'' آیا جس کی بے پناہ منطق اور پُر خلوص تنقید نے ان کا دامن کھینچا'' یہ محترم دوست لکھتے ہیں:

'' ہمارا خیال تھا کہ یوپی کے جو مقدر آزما
حضرات پنجاب میں کسی معاش کے لیے آتے
ہیں۔ وہی کانِ نمک میں آکر اپنی شیرینی کھو بیٹھتے
ہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ پنجاب کے ظالم لوگ
لاہور میں بیٹھ کر کاغذی آلاتِ حرب سے یوپی
والوں کی زبان کا قلعہ توڑ پھوڑ رہے ہیں''

پھر اس کے بعد اس مضمون میں محمد حسن عسکری صاحب کو لکھنؤ کی بجائے بلند شہر کا باشندہ ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ لکھنؤ کے بارے میں یاد دلایا جاتا ہے کہ

''فیض آباد سے اسی میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا
سا گاؤں بڑھتے بڑھتے ہوگیا تو لکھنؤ والوں نے
دہلی والوں کی زبان پر اعتراض شروع
کردیے۔''

اور یہ سنتے چلیے

''اہل پنجاب نے اِگے والوں، بھٹیاروں،
ماماؤں، لونڈیوں اور تنبولیوں سے اردو نہیں سیکھی،

انھوں نے اردو سیکھی ہے شبلی، حالی، نذیر احمد،
سرسید، میر تقی میر، غالب، ذوق، مصحفی اور داغ
سے۔''

غرض کہ اس طرح کے فقروں سے یہ پورا مضمون چشمکوں اور اختلافات کو بھی کچھ اس طرح لاتا ہے کہ ایک خوشگوار ذائقہ رہ جاتا ہے۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کا ہر جگہ کچھ نہ کچھ رول رہا ہے اور بعض موقعوں پر تو سنجیدہ سے سنجیدہ لوگوں کی حسِ مزاح چمک اٹھتی ہے۔ چنانچہ یہاں مولانا صلاح الدین احمد جیسے ثقہ ادیب بھی رک نہ پائے۔ خیر! اب ذرا معاملے کے دوسرے پہلوؤں پر آیئے۔

دہلی اور لکھنؤ کے درمیان اردو زبان پر جو تکرار رہی وہ تو اب تاریخ کا حصہ ہے کیوں کہ دہلی اور لکھنؤ کا وہ دور جب یہاں اردو زبان و ادب کا چرچا تھا وہ تاریخ کا حصہ بن چکا۔ مگر اردو کی مقبولیت اس کی جغرافیائی حدوں سے بھی آگے نکل گئی اور نہ صرف ہندوستان کے ہر خطے میں بلکہ دنیا کے اہم ملکوں میں اردو ادب تخلیق ہونے لگا رسالے اور کتابیں شائع ہونے لگیں۔ اردو یا کسی زبان کے لیے بھی اپنی جنم بھومی سے نکل کر دور دراز تک پھیلنے سے جہاں زبان اور اس کے ادب میں اضافے ہوتے ہیں، نئے اسالیب، نئے الفاظ، محاورے اور پیرایہ ہائے اظہار وجود میں آتے ہیں وہیں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زبان میں ردو قبول کے معیار کیا ہوں گے۔ دراصل یہ معیار بھی زبان بولنے والوں کی تعداد اور انکے علاقوں کی ضرورت کے مطابق خود بخود بڑے خاموش طور پر بدلنے لگتے ہیں۔ زبان کے معیاروں کے بارے میں ہمیشہ سے ایک بات پر زور دیا جاتا رہا ہے جسے لسانیات کے فروغ نے اور بھی قوت بخشی ہے وہ یہ عام اصول ہے کہ زبان کا انحصار استعمال کرنے والوں کے چلن پر ہے۔ لوگ جس زمانے میں عموماً جس تلفظ کو تسلیم کرلیں اور استعمال کرنے لگیں وہی صحیح ہے۔ چنانچہ اردو میں بے شمار الفاظ مختلف زبانوں سے آئے اور اردو والوں نے انہیں اپنی عادت اور مزاج کے مطابق کچھ اس طرح قبول کیا کہ ان کا اصل روپ یا ان کے معانی یا محلِ استعمال بدل گیا۔ اور یہی تبدیلی معیار بن گئی۔ انشاء اللہ خاں انشا کا مشہور بیان کہ ہر چند کہ اصل لفظ بیگم نہیں بیگم ہے جو ترکی سے اردو میں آیا ہے مگر جب ہم ترکی بولیں گے بیگم کہیں

گے ،اردو میں تو بیگم ہی صحیح ہے۔اس کے علاوہ بہت سے الفاظ محاورے اور زبان کے معیار محض اہلِ زبان کی عادت پر ہوتے ہیں ،اردو نے دہلی اور اس کے نواح میں جنم لیا پھر دکن گئی اگر چہ اردو ادب کا چرچا پہلے دکن میں ہوا اور اٹھارویں صدی کے وسط میں وہ لکھنؤ پہنچی ۔ یہ تبدیلی مختلف زبانوں میں دہلی اور اس کے گرد و پیش سے آبادی کے منتقل ہونے کے سبب ہوئی ۔ یہ لوگ دہلی کی زبان لے کر گئے اور جہاں بہت بڑی تعداد میں آباد ہوئے اور اقتدار میں بھی رہے وہاں ان کی تہذیب کے ساتھ ان کی زبان کو بھی اعلیٰ مرتبہ دیا جانے لگا۔ چنانچہ یہی لوگ اس علاقے میں زبان کا معیار بھی طے کرنے لگے۔ ہر زمانے میں زبان بولنے والوں کا عام طبقہ اس طبقے کے مقابلے میں بہت بڑا رہا ہے جس کے ہاتھ میں زبان کے معیار طے کرنے کا اختیار رہا ہے۔اہل اقتدار یا انکے ارد گرد رہنے والوں میں سے یہ فصحا کا طبقہ ابھرتا تھا۔ چناں چہ لال قلعہ کی زبان جسے معیار سمجھا جاتا تھا، اس کی پشت پر دہلی کی عوام کی زبان، جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان، کرخنداروں اور مختلف پیشہ وروں کے محلوں کی زبان کی قوت تھی ۔ دکن اور اس کے بعد لکھنؤ میں بھی سرکار دربار کی سرپرستی سے وہی زبان پھیلی جس کی بنیاد دہلی کے بنے بنائے معیار تھے۔ پھر لکھنؤ والے اپنے طور پر معیار متعین کرنے لگے مگر زبان کی بنیادی نوعیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔

ایک بات یہاں نہایت اہم ہے لکھنؤ اودھ کی حکومت کا دارالسلطنت تھا وہاں کی اصل زبان اودھی کی پوربی شکل تھی ۔ دکن میں تیلگو اور مراٹھی، گجراتی اور تامل کا رواج تھا۔ چنانچہ دونوں علاقوں میں وہاں کی اصل زبان کا اثر اردو پر پڑنا لازم تھا۔ وہاں کے فصحا نے مقامی اثر کو اس حد تک قبول کیا جہاں تک بھی ان کے نزدیک اردو کا مزاج اجازت دیتا تھا اور اس طرح دہلی سے الگ لکھنؤ بھی زبان کا ایک مرکز بن گیا۔ دکن کا قصہ بہت پرانا ہو گیا مگر ایک زمانہ تھا جب دہلی میں ادب کے نمونے دکن سے لیے گئے تھے ۔ ولی کا دہلی میں اثر اسی تاریخ کا ایک باب ہے۔

اٹھارویں صدی میں دہلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ آباد ہوا اور انیسویں صدی میں ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی اور لکھنؤ دونوں برباد ہوئے ۔ بڑی تعداد میں مختلف شہروں کی طرف لوگوں نے رخ کیا۔ رام پور، حیدر آباد جیسی ریاستوں میں ان کی سرپرستی ہوئی اور دہلی اور لکھنؤ کے باہر بھی ادب کا

چرچا ہونے لگا۔ ایک اہم بات یہ ہوئی کہ دہلی کی تباہی کے بعد شمال میں برطانوی حکمرانوں نے لاہور پر توجہ کی اور ایسے ادارے ظہور میں آئے جہاں نہ صرف دہلی سے بلکہ ملک کے مختلف قصبوں سے آمدورفت کے ذرائع کی بدولت بھی مختلف لسانی علاقوں کے لوگوں میں رابطہ بڑھنے لگا۔ انگریزوں کے آنے کے بعد حکومت نے بھی اپنے مقاصد کی تکمیل کی طرف توجہ دی اور خود لوگوں میں بھی یہ احساس جاگنے لگا کہ تعلیم کے بغیر وہ غلامی سے نجات نہیں حاصل کر سکتے۔ چنانچہ ملک میں تعلیم اور تعلیمی اداروں کے فروغ نے دہلی اور لکھنؤ سے باہر اردو زبان کو پھیلانے میں بڑا حصہ لیا اور ہندوستان کے تقریباً ہر شہر میں ادیب وشاعر پیدا ہونے لگے۔ صحافت، سنیما، ریڈیو اور پھر بعد میں ٹیلی وژن کی مقبولیت اور اہمیت ہماری زندگی میں بڑھی اور معیاری زبان تحریر کے دائرے سے نکل کر بولی جانے والی زبان کے قریب آنے لگی۔ دراصل اردو زبان کے فروغ کے اعتبار سے بیسویں صدی کو پنجاب کی صدی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اقبال سے لے کر فیض اور پھر بیدی، کرشن چندر، منٹو غرض کہ جس کا بھی نام لیں وہ سب پنجاب سے نمودار ہوئے اور تقسیم ہند کے بعد دہلی اور لکھنؤ سے منتقل ہونے والے اہل ادب کی تعداد بہت بڑی ہے جن میں سے زیادہ تر لوگ لاہور میں مقیم ہیں۔ وہاں کے سرکاری اور قومی زبان بھی اردو ہے۔

اب جب کہ نہ دہلی اور لکھنؤ وہ رہے نہ وہ فصحا رہ گئے تو زبان کے معیار کون طے کرے گا۔ یہ سوال آج کا ہے مگر یہ اس وقت سے اٹھنا شروع ہوا تھا جب دہلی کا شیرازہ بکھرا تھا۔

اردو میں معیار بندی سے لگاؤ اس کی ایک روایت ہے جو زبان کے مزاج کو محفوظ رکھنے میں بہت کام آتی ہے۔ اور جس کو اس زبان کی شیرینی اور لہجہ کی شائستگی الفاظ محاوروں اور فقروں کی برجستگی اور ایک قسم کی حسِ مزاح کی زیریں لہر سے تعبیر کیا جاتا ہے جس میں پھبتی کا اور ضلع جگت وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔ مگر معیاروں کے اسی لگاؤ سے سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ آج زبان کے معیار کیسے بنیں گے اور کون بنائے گا پھر زبان کے پھیلاؤ میں معیاروں سے یہ ضرورت سے زیادہ رغبت رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ اردو میں دوسری زبانوں کے اثرات تو

بہت آئے اور جذب کر لیے گئے مگر یہ اس قدر رک رک کر آئے ہیں کہ زمانہ آگے نکلا جا رہا ہے۔
پڑھے لکھوں کا ایک باشعور اور تمیز و امتیاز کی صلاحیت رکھنے والا بڑا طبقہ اب بھی ہر جگہ موجود ہے
اردو والوں کے مزاج میں کہیں نہ کہیں روایت اور معیار کا یہ تقدس جاگزیں ہے خواہ وہ اس کی پوری پابندی کرنے میں بہکتا، بھٹکتا کیوں نہ ہو۔

تحریک آزادی اور اردو نظم

دنیا کا کوئی بھی بڑا واقعہ خواہ وہ سیاست سے تعلق رکھتا ہو، تہذیب سے متعلق ہو، مذہب اور فلسفہ کا زائیدہ ہو اگر واقعی بڑا واقعہ ہے تو اس کی وسعتیں محدود اور متعین نہیں رہ سکتیں۔ اس کے اثرات انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو میں اس قدر دور تک سرایت کر جاتے ہیں کہ وہ مدتوں ہر روپ میں جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں وہ سانس کی طرح ہمارے وجود میں سمائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمارے خون کے ساتھ رگ و پے میں دوڑتے رہتے ہیں۔ ساری انسانی تاریخ کے نقش اسی طرح ہزاروں سال تک بنتے اور پھر ہمیشہ کے لئے نقش بھی ہوتے رہتے۔ ہیں زمانہ کوئی بھی ہو، سرزمین کہیں کی بھی ہو، سماج کیسا ہی ہو، اس فطری عمل سے عاری نہیں رہ سکتا۔ وہ وقت بھی جب انسان کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا اپنی نشانیاں نہ جانے کن کن جگہوں پر کس کس انداز میں چھوڑ گیا ہے۔ کہانیاں ناچ گانے رسمیں، لباس، عمارتیں، تصویریں غرض کہ تہذیب کے ہر رنگ میں دنیا کے بڑے واقعات جلوہ گری کرتے رہتے ہیں۔

ہماری آزادی کی جدوجہد بھی تاریخ کا اتنا ہی بڑا واقعہ ہے، جو ہماری قومی اور انفرادی زندگی، کے ہر پہلو میں اپنا روپ دکھاتا رہا ہے۔ شعر و ادب تو انسان کی اندرونی دنیا میں برپا ہونے والی ہل چل کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسی لئے انسانی زندگی کے واقعات کا اتنا سچا اور مقبول ہونے والا کوئی اور شعبہ نہیں۔ ماحول میں اٹھنے والا کوئی بھی طوفان، کوئی بھی ہنگامہ یا حادثہ جب شعر و نغمہ میں ڈھل جائے تو ہمیشہ اپنا جادو جگاتا رہتا ہے۔ وہ عام انسانی یادداشت کا لازمی حصہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک کا وہ شعر و ادب جو جہد آزادی کے نشیب و فراز کے ساتھ پروان چڑھا، نہ صرف اس

دور کے ہندوستان کی جذباتی اور داخلی کیفیات کا آئینہ ہے۔ بلکہ وقت گزرنے کے بعد بھی ہر زمانے میں یہ دور جیتا جاگتا ملتا ہے۔مگر اردو نظم کا اپنا ایک انداز اور دائرہ اثر ہے جو بعض دوسری اصناف کے مقابلے میں زیادہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔نظم میں شاعر کے لئے اظہار کی گنجائش زیادہ ہے۔ یہاں جذبات جس طرح بے روک ٹوک اُبل پڑتے ہیں اس کی اجازت غزل جیسی صنف جو ہماری مقبول ترین صنف ہے نہیں دے سکتی۔ چنانچہ پچھلے سو سال میں اردو نظم کا فروغ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ یہ اس عہد کا فطری تقاضا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری کا کلاسیکی دور تو وہ تھا جب ہندوستان اپنی آزادی کھو رہا تھا۔ اندرونی افراتفری یورپی فوج کی ریشہ دوانیاں اور ہمارے اپنے نظام سیاست ومعیشت کی کمزوریاں بڑھتی چلی جارہی تھیں۔ اس پورے دور کی داستان ہماری غزلوں،شہر آشوبوں، ہجوؤں، رباعیوں، اور قطعات میں رقم ہے۔سراج الدولہ کی شکست سے لے کر 1857 کے ہنگامے تک کون سا ایسا واقعہ ہے جو ہماری نظم میں اپنا نقش نہیں چھوڑ گیا۔نظموں میں شاعر کا اپنا احساس اتنی شدت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد سب ہی لوگوں کو اس میں اپنا شریک بنالیتا ہے۔اور اگر پورا سماج بھی اسی طرح کے ردعمل کو محسوس کر رہا ہو تو شاعر اپنے زمانے پر گہرا اثر ڈالنے لگتا ہے۔اور یہ اثر اس حد تک ہوتا ہے کہ بسا اوقات اسے خطرناک بھی سمجھا جانے لگتا ہے۔اور ہمارے یہاں اکثر انگریزوں کی سامراجی حکومت کو ادب کی اشاعت پر اگر پابندی لگانی پڑی اور شاعروں اور ادیبوں کو گرفتار کرنا پڑا تو اس کہ وجہ یہی خوف تھا کہ شاعری اور ادب بھی ان کی حکومت کو گرانے میں اہم حصہ لے سکتی ہے۔

اردو میں نظم تو ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔نظیر اکبرآبادی کی نظموں سے آج کون واقف نہیں، ہر نظم کو ایک تحریک کے طور پر سرسید اور ان کے رفقاء نے بڑے پیمانے پر فروغ دیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد قومی اصلاح اور وطن دوستی کے جذبات جتنی تیزی کے ساتھ پھیلے اور قوم کے ہر فرد کے دل ودماغ میں جس طرح سما گئے اس کا اظہار شاعری سے بہتر اور کہاں ہوسکتا تھا وطن دوستی کی ابتدا اصلاحی تحریک کے ساتھ ہوئی اور سماجی اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کر نظمیں لکھی جانے لگیں، خصوصاً حالی اور آزاد کی نظمیں اس اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ پھر شبلی، اکبر، چکبست اور اقبال جیسے شاعروں نے اسے ایک نئی

سیاسی جہتوں سے آشنا کرایا۔ سامراج کے مظالم، تہذیبی اقتدار کا تصادم، بین اقوامی سازشیں اور پھر خود اپنی کمزوریاں ہماری شاعری کا موضوع بنی، اقبال کے یہ اشعار اس ساری کیفیت کو پیش کرتے ہیں۔

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل ہی گامزن محبوبِ فطرت ہے۔

اشتراکی فلسفہ کے فروغ کے ساتھ ترقی پسند تحریک ظہور میں آئی اور جب آزادی کی تحریک اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوئی تو احتجاج اور انقلاب کی ایسی بلند آوازیں اردو نظم کے ذریعے سارے ملک میں گونجنے لگیں جس کا اندازہ نہ اس سے پہلے کبھی خود شعر و ادب کی دنیا میں رہنے والوں کو تھا اور نہ سیاسی زندگی کی ہماہمی میں گھرے ہوئے لوگوں نے یہ سب کچھ سوچا تھا۔ سیاست اور شاعری کا ایسا ملاپ اس بات کا ثبوت تھا کہ آزادی کی خواہش اور سامراج کی سازشوں کے خلاف تحریک صرف سیاسی دنیا تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ ہماری ثقافت کی رگ رگ میں پروان چڑھ رہی تھی۔ وہ شعرا بھی عشق و رومان میں سر بسر ڈوبے ہوئے تھے آزادی کے گیت گانے لگے۔ بلکہ آزادی بھی ان کے رومانی خواب و خیال کا حصہ بن گئی، اختر شیرانی جیسا رومانی شاعر کہنے لگا۔

عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے
عشق میری جان آزادی میرا ایمان ہے

عشق پر کردوں فدا میں اپنی ساری زندگی
اور آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

تحریک آزادی کے سائے میں جو شاعر نمایاں ہوئے ان میں جوش ملیح آبادی سب سے زیادہ اہم ہیں۔ ان کا کلام موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے بھی اہم ہے اور اس بلند آہنگی کی بنا پر بھی منفرد ہے جو آزادی کے جوش وخروش اور ہنگاموں اور نعروں کی فضا کے ساتھ اردو شاعری میں آئی۔ جوش کی بعض نظموں کی مقبولیت ان کے باغیانہ لہجے کی بنا پر اتنی بڑھی کہ ان کی نظمیں ضبط بھی کی گئیں۔ ان کی شاعری میں منظر نگاری، رومانیت، حسن پرستی اور حسن آفرینی سب کچھ ہے۔ مگر انھیں پہچانا گیا شاعر انقلاب کے طور پر۔ انھوں نے مرثیے کی صنف کو بھی اپنے عہد کے انقلابی تصورات سے ہمکنار کیا جو اردو شاعری میں بالکل ایک نئی بات تھی۔ جوش کے علاوہ ساغر نظامی، روش صدیقی اور بہت سے دوسرے شعرا نے آزادی کے نغمے گائے۔ دراصل پوری فضا ہی کچھ ایسی تھی کہ ہر فن کار اپنے اپنے طور پر اس سے ذہنی اور جذباتی حوصلہ اور قوت پاتا تھا۔ جو اس کے فن میں بھی جھلک آتا تھا۔

آزادی آئی تو اس کے ساتھ تقسیم ملک کی غارت گری نے سارے پرانے خواب چکنا چور کر دیے اس دوران میں ترقی پسند شاعروں نے ملک کی تشویش ناک صورت حال سے متاثر ہو کر جو نظمیں لکھیں وہ اس عہد کی تاریخ کے ساتھ یادگار رہیں گی۔ بعض کے الفاظ میں یہ داغ داغ اجالا اور سب گزیدہ سحر تھی۔ سردار جعفری، کیفی، مجروح، جذبی، مجاز سب ہی کے ہاں ایک افسردگی اور اس کے ساتھ آزادی کے وقت سامراجی ریشہ دوانیوں کے خلاف احتجاج کی آواز نمایاں ہے اس دور میں جگر جیسے شاعر کے یہاں بھی روایتی تغزل سے انحراف ملتا ہے۔ ان کی نظم نما غزل بہت مشہور ہوئی۔

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

غرض کہ تحریک آزادی کا لمحہ لمحہ اردو نظم میں جلوہ گر ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو شاعری تخلیق کار کے انفرادی کرب ونشاط کے ساتھ ساتھ گرد وپیش کے اثرات سے ہمیشہ جلا پاتی رہی۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو نظم

آزادی کے بعد وجود میں آنے والا ادب، قبل آزادی کے ادب کی ہی ایک نئی اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ آج کی نظم کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس تاریخی تسلسل کو ذہن میں رکھا جائے اور ان کڑیوں کو تلاش کیا جائے جو دو زمانوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔ آزادی سے پہلے اردو نظم دو محوروں اقبال اور جوش کے گرد گھوم رہی تھی۔ نئے ادب اور ترقی پسند تحریک نے نظم کی روایت کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ بدلتے ہوئے معاشرے میں فرد اور سماج کے پیچیدہ تر ہوتے ہوئے رشتوں اور ان سے پیدا ہونے والی نئی الجھنوں کی بدولت شاعرانہ ادراک و احساس اور اس کے اظہار کی صورتوں میں زبردست تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ آزاد نظم کا فروغ نئے اسالیب اظہار نئی شعری علامتیں اور ایک بدلی ہوئی زبان وجود میں آئی۔ ساتھ ہی ساتھ نئے موضوعات جن کو چھونا تو در کنار ان کی سمت بڑھتے ہوئے بھی تخیل کے پر جلتے تھے، اب اردو نظم کے مزاج کا مانوس اور مقبول حصہ بن گئے ہیں۔ شاعری میں کلاسیکی روایات سے بغاوت محض بعض شاعروں کی ندرتِ فکر اور طباعی کا ہی کرشمہ نہیں تھی۔ یہ رجحان سماجی سطح پر برپا ہونے والی بے شمار بغاوتوں کا ایک تسلسل تھا۔ فیض، مجاز، اختر شیرانی، راشد کی نظم کے حسن کی مقبولیت کا راز اس بغاوت میں پنہاں ہے۔ دیہاتوں سے شہروں کی طرف یلغار مدتوں کی بسی بسائی بستیوں کا منتقل ہونا خاندانوں کا ٹوٹنا اور بکھرنا نئے کارخانوں کا وجود میں آنا اور صنعتی نظام کا آہستہ آہستہ صدیوں کے بنے بنائے جاگیردارانہ نظام پر چھاپا مارنا یہ سب ہماری زندگی میں ایک بے اندازہ اور بے پناہ تبدیلیوں کے امکانات لے کر آئے۔ آزادی کے بعد اس تبدیلی کی تیز رفتاری نے جذبہ و فکر کی دنیا میں ایک حشر برپا کر دیا۔ یہ ہمارے دور کے حساس انسانوں کے لئے بہت بڑا چیلنج تھا اور ہمارے شاعروں نے

اسے جس طرح قبول کیا اس کا ثبوت اس دور کی نظموں میں ملتا ہے۔

پچھلے دور میں نظم میں بڑے اہم اور قابل قدر تجربات کئے گئے۔ چنانچہ میرا جی، راشد، فیض، سردار جعفری اور اختر الایمان نے نظم میں جن روایات کی بنیاد ڈالی تھی نئے شاعروں نے انہیں نئی وسعت اور نئی معنویت دی۔ چنانچہ آج تک تکنیک کے اعتبار سے میرا جی اور راشد اور فکر و احساس کے اعتبار سے فیض اور اختر الایمان کی آوازوں کی گونج زیادہ سنائی دیتی ہے۔

آزادی کے بعد سیاسی تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کی بدولت ادب کی سطح پر بھی نمایاں اور اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہمارا شاعر جو کبھی شکستِ زنداں کا خواب دیکھا کرتا تھا اب اس خواب کی تعبیر سے دوچار ہوا۔ تقسیم ملک نے شاعر کے ضمیر کو بے چین کر دیا اور اب پہلی بار شاعر نے محسوس کیا کہ کبھی کبھی بادہ و ساغر کہے بغیر بھی نہ صرف بات بن سکتی ہے بلکہ زیادہ موثر بات بھی کہی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس زمانہ میں غزل نما نظموں اور نظم نما غزلوں کا ایک بے پناہ ذخیرہ سامنے آ گیا۔ جگر جیسا خالص غزل گو شاعر اب کہنے لگا۔

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

آج کی اردو نظم بہت کچھ ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کی مرہون منت ہے۔ یہ تحریک آزادی کے چند سال بعد انتشار کا شکار ہوگئی۔ مگر ترقی پسند شاعروں کا ایک گروہ جو اس پندرہ برس کے عرصے میں ابھرا تھا وہ خاموش نہیں ہوا، گو کہ ان کے ادبی رول میں بہت اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

ترقی پسندوں کے اس طبقے میں دو قسم کے شاعر نظر آتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کی اٹھان بڑے زور اور گھن گرج کے ساتھ ہوئی تھی مگر جو بہت جلد کلاسیکیت کے حصار یا رومانیت کے خول میں واپس لوٹ گئے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو مارکسزم کو تو مانتا تھا مگر جس نے پارٹی ڈسپلن کی مار سے بچنے کے لئے اپنی شاعری کو اپنے خلوص و ایمان کی سوگند بنانے کی کوشش نہیں کی۔ ان شاعروں کو ایک عرصے تک اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ ان کی شاعری میں نقارے اور بگل کی گونج نہیں تھی۔ ترقی پسندوں کا ایک المیہ یہ ہے کی پہلی قسم کے شاعروں کی بدولت ایک زمانے میں ترقی پسندی اور

پست شاعری ایک ہی شے کے دو نام ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ آج کا شاعر اپنے آپ کو اس ترقی پسندی سے ممتاز کرنے کے لئے ترقی پسندی کو ہی رد کرنے لگا۔ حالانکہ خود اس کی شاعری کے خمیر میں ترقی پسندوں کا چھوڑا ہوا ورثہ شامل ہے۔ فکری اور فنی اعتبار سے فیض کی نظم ''تنہائی'' مجاز کی ''آوارہ'' اور جذبی کی ''موت'' آج بھی اتنی ہی جدید ہیں جتنی کہ کبھی تھیں۔ ترقی پسندوں کی اس طرح کی نہ جانے کتنی تخلیقات ہیں جو اس تسلسل کی نشاندہی کرتی ہیں جو آج کی شاعری اور ترقی پسندی کے دورعروج کی شاعری میں فطری طور پر موجود ہے۔ دونوں کی تہہ میں ایک ہی جذباتی رونظر آتی ہے اور یہ رو ہے ادبی تہذیبی اور سماجی سطح پر باغیانہ جرأت فکر واحساس کی رو۔

حال میں ان رجحانات کا مختلف زاویوں سے تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ بعض نے تو انھیں کو اقلیدس کی اصطلاحوں، خطِ مستقیم اور خط منحنی کے تحت بھی تقسیم کر دیا ہے۔ میرے خیال میں اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ شاعر کی شخصیت سماج سے الگ نہیں بلکہ سماجی حقیقت کا ایک جز ہے۔ وہ شاعر جو اپنی شخصیت اور اپنے زمانے کے درمیان ''من تو شدم تو من شدی'' کا رشتہ قائم نہیں کر سکتے اپنے آپ کو سماج کا فعال فرد ثابت کرنے کی تمنا میں شاعری کو میکانکی طور پر سماجی تبدیلی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا وہ حصہ جسے ترقی پسند حصہ سمجھا یا کہا جاتا ہے اچھی شاعری کے معیاروں پر بھی پورا نہیں اترے گا اور معمولی درجہ کی شاعری ہونے کی وجہ سے تہذیبی سطح پر وہ انقلابی رول بھی ادا نہیں کر سکے گا جس کی اس سے امید کی جاتی ہے۔ دوسری قسم کی شاعری وہ ہے جس میں شاعر کی تخلیقی فکر اور اس کا سماجی شعور دونوں ایک دوسرے سے اس طرح ہمکنار ہو جاتے ہیں کہ اس کے یاں داخلی وخارجی حقائق کی دوئی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا اپنا غم زمانے کا غم ہوتا ہے اور زمانے کا غم اس کے اپنے دل کا کرب واضطراب بن جاتا ہے۔ فیض اور اختر الایمان کے گروہ کے شاعر (یا جنھیں خط منحنی کا شاعر کہا گیا۔) اس رجحان کے نمائندہ ہیں۔ پہلے رجحان کی نمائندگی زیادہ تر ہنگامی موضوعات پر کی جانے والی شاعری مثلاً ہندو پاکستان اور ہندو چین کی لڑائی کے سلسلے میں وجود میں آنے والی نظمیں، قومی یک جہتی، بھاکڑ اڈیم لیڈروں کی موت پر مرثیوں سے لے کر فیملی پلاننگ تک کے موضوعات پر کہی جانے والی نظمیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔

آزادی کے بعد اردو نے مغرب کی تکنیک کو پہلے سے زیادہ اپنانے کی کوشش کی ہے۔ عالمی ادب کے مطالعے سے سیکھنا، ہر لحظہ بہتر اقدار کی تلاش کرنا اور انھیں پا کر اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرنا صحت اور زندگی کی علامت ہے۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اکثر ذہنی کاہلی اور سہل پسندی بھی اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ دوسرے ملکوں کے فلسفیوں کے افکار کو (خواہ ان کے جنم دینے والے ہی ان سے دستبردار کیوں نہ ہو چکے ہوں) اس وجہ سے قبول کر لیا جائے کہ وہ کچھ نئے نئے سے لگتے ہیں۔ چنانچہ وجودیت کا فلسفہ جس کا جنم دوسری، جنگ عظیم کے بعد یورپ میں ہوا تھا اردو کے بعض شاعروں کے یہاں اس کے ختم ہو جانے کے بعد آیا اور وہ اسی طوفان میں بہتے ہوئے نظر آنے لگے۔ مگر عظمتوں کو اپنے سر زبردستی اوڑھنے کا بہانہ خواہ ترقی پسندی کو بنایا جائے یا جدیدیت کو بالآخر شاعر کے مرتبے کا تعین تو اس حقیقت کے پیش نظر ہی ہوتا ہے کہ اس کے ہاں فکری اور فلسفیانہ خلوص کتنا ہے، اور اس کی شخصیت کے واسطے سے اس کے فن پر اس کا کوئی صحت مند اثر پڑا ہے یا نہیں۔ چنانچہ وہ نظم جو موجودہ حالات سے بے اطمینانی پر مبنی ہے خواہ وہ کسی مقبول نظریے سے بے نیاز شاعر کی ہی تخلیق کیوں نہ ہو نہ صرف آج کی عظیم شاعری ہے بلکہ اس کی عظمتوں پر پڑے ہوئے وقت کے پردے ہر دور میں اٹھتے چلے جائیں گے۔ اس دور کی نظم میں چند الفاظ کی تکرار جا بجا ملتی ہے۔ شہر، سایہ، سورج، دھوپ، آئینہ، عکس اور اس طرح کے بہت سے الفاظ نئی شاعری کی جانی پہچانی علامتیں ہیں جو آج کے حساس انسان کے روحانی اضطراب کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً شہر ہمارے موجودہ سماج کی علامت ہے جو صنعتی زندگی کی اعصاب شکن ہماہمی اس کے جنم دئے ہوئے تہذیبی بحران اور اس کے اجتماعی ظلم و جبر کی بدولت فرد کی انفرادیت کی پامالی کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں انسانی رشتے بہیمانہ کشاکش پر مبنی ہیں۔ جہاں لوگ اپنے اصلی چہرے کھو چکے ہیں اور ان کی ذات خود ان کے سائے کی طرح جھوٹی بے حقیقت بے معنی بلکہ کبھی کبھی ڈراؤنی بھیانک اور قابل نفریں نظر آتی ہے۔ یہاں سورج روشنی کی علامت نہیں بلکہ سیاہ پوش ہے اور دھوپ جھلسا دینے والی نگاہوں کو سلب کر لینے والی آتش بار شعاعوں کا نام ہے۔

جدید نظم کی یہ علامتیں آج کے شاعر کے ایک مخصوص رویے کا پتہ دیتی ہیں جو بنیادی طور پر باغیانہ اور اسی لئے قابل قدر ہیں۔ مگر اسی کے ضمیمے کے طور پر بعض شاعروں کے ہاں منفیت

پرستی کا رجحان بھی ابھرا ہے۔ان کے ہاں اپنے گردو پیش سے بے چینی تو ہے مگر یہ بے چینی انھیں دنیا و مافیھا سے منہ موڑ لینے کی طرف زیادہ مائل کرتی ہے۔ یہ رجحان قرون وسطیٰ کی خانقاہیت سے بہت زیادہ قریب نظر آتا ہے مگر شاید نئی شاعری کا یہ رجحان دیرپا نہیں بلکہ ایک عارضی، اضطراری کیفیت کا اظہار ہے جو ہر حساس فن کار اور دانش ور کی فکری و جذباتی نشوونما میں کسی نہ کسی موڑ پر ضرور غالب نظر آتی ہے۔ ادھر چند برسوں میں اردو شاعری کے اس عارضی موڑ کو ایک فلسفہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ہر چند کہ یہ کوشش لا حاصل ہے مگر اس اعتبار سے خطرناک بھی ہے کہ وہ شاعر کے فن اور پڑھنے والوں کے مذاق دونوں کو برباد بھی کر سکتی ہے۔فرد کی تنہائی سماج کی ساری قوتوں کا اس کے خلاف صف آرا ہونا شہری زندگی کی افراتفری جہاں کوئی کسی کا ساتھی نہیں باہمی ربط اور صدیوں کی پالی پوسی انسانی شرافتوں کا اچانک ہوا میں تحلیل ہو جانا، فرد کا ایک بے جان مشین کے پرزے کی طرح چکر کھانا اور ایسا لگنا کہ جیسے ہماری آپ کی تقدیر اور زمانے کی ہر شے کی نکیل کسی انجان بے درد اور اندھی قوت۔کے ہاتھ میں ہے، ایک بٹن کے دبنے کی دیر ہے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگے گیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ بھسم ہو جائے گا۔آج کے شاعر کا سب سے بڑا مسئلہ ہے (ان کے کہنے کے مطابق) زبان ابلاغ اور ترسیل کی دقتیں۔اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ افراد کے درمیانی باہمی رشتے ختم ہو چکے ہیں ایک فرد دوسرے فرد سے اس قدر دور ہو گیا ہے کہ کسی کی آواز کی گونج دوسرے تک پہونچے تو پہونچے اس کی بات اس تک نہیں پہونچ سکتی۔ایسی صورت میں فنکار کا فن اس کے جذبات کا ادھورا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ساتھ ہی ساتھ وہ زبان اور وہ شعری سانچے جو صدیوں کے تجربات نے جنم دئے تھے اب جامد شے بن گئے ہیں۔یہ وہ پتھر ہیں جن کی رگوں سے شرارہ بن کر صرف اس وقت ٹپک سکتا ہے جب فنکار کے احساس کی گرمی ان کی تسلیم شدہ اور جانی بوجھی صورتوں کو پگھلا کر ان سے نئے ہیولے تراشے۔اس کی بات اگر کوئی سمجھے تو یہ سمجھنے والے کی توفیق و تقدیر پر ہے۔شاعر کو اس سے غرض نہیں کہ کوئی ان کا سمجھنے والا ہے یا نہیں۔اس زبان کے نہ سمجھنے والوں کو اکثر یہ کہکر ٹال دیا جاتا ہے کہ یہ تو مستقبل کی زبان اور مستقبل کی نظم جنم لے رہی ہے۔ ماضی کے آدمی ہیں اتفاقاً حال میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اسلئے یہ زبان آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ابلاغ کی دقتوں اصل سبب یہی بتلایا جاتا ہے۔گویا کہ

ہمارے جدید شاعروں کا یہ طبقہ مستقبل کی شاعری کو جنم دے رہا ہے۔ وہ مستقبل جو خود اسکے فلسفے کے مطابق بڑا تاریک ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ شاعر جو آج کی شہری زندگی کی ہماہمی سے سہمے ہوئے ہیں اور نیلی، لال ہری روشنیاں انکی آنکھوں کو چکاچوند کیے دے رہی ہیں وہ بھلا مستقبل کی تاب کیسے لاسکیں گے۔ جہاں مشینیں آج سے زیادہ ترقی یافتہ ہوں گی۔ جب مسائل آج سے زیادہ گمبھیر ہوں گے اور انسان کو سماجی رشتوں کے تعین میں اور زیادہ الجھنوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ گاؤں کی سادہ پرسکون اور خاموش زندگی کو شہروں میں نہ پاکر اپنے وہم وگمان کی دنیا میں سمٹ جانے والے ذہنوں اور انکی تخلیقات کو بربادی سے بچانے والی قوت جس سے وہ محروم ہیں وہ کہاں سے آئے گی۔ اسکا جواب ان شاعروں کے ہاں نہ جانے کیا ہوگا۔ میرے نزدیک تو ہر دور کی زندگی مادی اور روحانی طور پر انسانی ذہن کو چیلنج کرتی رہی ہے۔ اس چیلنج کو قبول کرکے انسانوں کو اسی کشاکش کا مقابلہ کرنے کی ذہنی جذباتی اور روحانی صلابت عطا کرنے کا کام فنون لطیفہ اور شعر وادب نے انجام دیا ہے۔ اور عظیم ادب خواہ وہ کسی عہد کا ہی کیوں نہ ہو وہی ثابت ہوا ہے جو جذباتی طور پر اپنے عہد کا مسیحا بھی ہو اور نئے عہد کا پیغامبر بھی۔ دراصل شاعری کا یہی داخلی جذباتی عنصر ہے جو ایک عہد کی شاعری کو اس عہد سے بلند کرکے ہر عہد کی شاعری بنا دیتا ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو نقشِ پا پایا

یہ پچھلی صدی کا شعر ہے مگر اس کی معنویت کے ہر لحظہ بدلتے ہوئے نئے پن نے اسے آج کا شعر بنا دیا ہے۔ آج کی نظم کو نئے دور کے چند چیلنج درپیش ہیں۔ ترسیل کے نئے وسائل ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سنیما نے چند نئی سمتوں کو روشن کیا ہے اور یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ یہ شیطانی قوتیں فنون لطیفہ کی خصوصاً شعروادب کی دشمن ہیں۔ سائنس کے دور کے ستم ہی کیا کم تھے اس پر طرّہ یہ کہ اس نے انسان کی خلوتوں پر بھی چھاپہ مارنا شروع کر دیا۔ اسی رویے کا نتیجہ ہے کہ شرفا کی ادبی مجلسوں میں ان شاعروں کو برادری سے باہر سمجھا جاتا ہے جنھوں نے سنیما کے میڈیم کو اپنالیا اور اپنی شاعری کو چھپے ہوئے لفظوں سے زیادہ مغنیوں کی آوازوں اور رنگین پردوں کے

ذریعہ سننے اور دیکھنے والوں تک پہنچایا ہے۔ ان نئے وسائل کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شعر و ادب کو ان طبقوں تک پہنچایا جو پڑھے لکھے نہ ہونے کی بنا پر اس سے محروم تھے۔ آج کے شاعر کو ان وسائل سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ شیکسپئر کے منظوم ڈرامے اسٹیج پر پیش کئے جانے کے باوجود ادب کا بہترین شاہکار پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ ان وسائل کا شعر و ادب سے کس طرح ناتہ مضبوط کیا جائے۔ فلمی شاعروں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا چرچا محض طعنوں، تشنوں اور کوسنوں سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

اس زمانے میں طویل نظموں میں بھی بڑے اچھے اور کامیاب تجربے کئے گئے۔ ساغر کی 'انارکلی' کے بعض حصے بڑے دلکش ہیں۔ گو کہ اس میں جگہ جگہ ناہمواری اور غیر ضروری طوالت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ لمبائی چوڑائی کی نسبت سے ہی اگر گہرائی بھی ہوتی تو یہ بڑی کامیاب نظم تھی۔ ساحر کی طویل نظم 'پرچھائیاں' نہ معلوم کیوں طویل ہوگئی۔ مختصر ہوتی تو شاید اچھا ہوتا۔ انکے بعض حصوں پر ترقی پسندی کے اس دور کی چھاپ ہے جس کا ذکر ابھی کیا جا چکا ہے۔ لیکن سردار جعفری کی ''نئی دنیا کو سلام'' کے بعد سب سے زیادہ چونکا دینے والی طویل نظم عمیق حنفی کی ''سند باد'' ہے۔ یہ نظم چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ مگر مرکزی خیال ایک ہے اور وہ یہ آج کا انسان خود اپنی سرزمین پر اسی طرح گزرتا ہے جیسے کہ سند باد اَن دیکھی سرزمینوں سے گزرا تھا۔ یہ سند باد دراصل غالب کا غریب شہر ہے۔ نظم کی اوپری سطح پر ششدر ہونے والی کیفیت اور حیرانی کی ایک شفاف چادر پھیلی ہوئی ہے جو درد میں ڈوبے ہوئے طنز کی ایک دنیا چھپائے ہے۔ نظم کے ٹکڑے کلاسیکی اشعار دوہوں مقولوں اور آیتوں سے جوڑے گئے ہیں۔ جس کا مقصد انسانی روح کے اضطراب کو ایک ایسی وحدت کے روپ میں پیش کرنا ہے جو زماں و مکاں سے بلند ہے اور ہر پُر آشوب زمانے میں نمودار ہوتی ہے۔ ایک کامیاب اور فکر انگیز تجربہ ہے جس سے مستقبل کی اردو نظم کی سمتوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ مگر عمیق حنفی کی ساری شاعری کے سیاق و سباق میں رکھ کر اسے دیکھا جائے تو یہ خطرہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ کہیں وہ بھی بالا آخر اپنی ذات کے نہاں خانے میں سمٹ کر غائب نہ ہو جائیں۔

کلیم الدین احمد کی نظمیں تکنیک کے اعتبار سے تازہ اور دلکش ہیں تخیل کی تازگی ملتی ہے مگر

جنسی تلذذ پر ضرورت سے زیادہ زور اس بات کی بھی غمازی کرتا ہے کہ یہ نظمیں صرف چونکا دینے کے لئے لکھی گئی ہیں جنس، آج کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر اس قدر چونکا جائے۔

اس دور کے سب سے اہم شاعر جنھوں نے نظم کو نئی سمتوں سے آشنا کرایا سردار جعفری، کیفی اعظمی اختر الایمان اور مخدوم ہیں۔ سردار جعفری کی نظم انیس کی نازک خیالی، اقبال کی مرعوب کن معنویت اور جوش کی رومانیت سے مرتب ہے۔ ان کے ہاں تشبیہات واستعارات اور حسین الفاظ کے ذریعہ نظم کی آرائش پر زیادہ زور ہے۔ مگر آزاد نظم جو میراجی اور راشد کی ابہام پرستی اور لاشعوری طرز اظہار کی بدولت صرف محدود حلقے تک پہونچ سکی تھی اسے سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے تجربات کی بدولت ہی مقبولیت ملی۔ مخدوم اور اختر الایمان نے اپنی ڈگر الگ بنائی گو کہ ان کے اسلوب کا سلسلہ فیض سے جا کر ملتا ہے۔ اختر الایمان کی نظم کے حسن کا اصل سبب یہ ہے کہ انھوں نے کلاسکیت کے شکوہ اور رومانیت کی رنگینی سے آزاد ہو کر زندگی کے کھردرے پن کا شاعرانہ عرفان حاصل کیا۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اس طلسم کو توڑا کہ اردو میں تغزل اور رومانیت کے بغیر اچھی شاعری ممکن نہیں۔ مخدوم کی نظم کا سب سے اہم پہلو اسکی غنائی دلکشی ہے۔ انکے ہاں آزاد نظم نے اپنے اندر چھپی ہوئی موسیقیت کو پالیا۔ مخدوم ایک جانے پہچانے مارکسی شاعر ہیں اور ان چند شاعروں میں ہیں جن پر مارکسیت کی ترویج واشاعت کے لئے شاعری کے جمالیاتی مزاج کو مجروح کرنے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ ان کے ہاں اب رومانیت کی لے بڑھتی جاری ہے۔ ان کے علاوہ ان شاعروں میں جو ۴۷ء کے بعد مقبول ہوئے مگر آہستہ آہستہ روپوش ہونے لگے۔ کیفی اعظمی، جاں نثار اختر اور وامق جونپوری اہم شاعر تھے۔ جن کی نظمیں تقسیم ملک کے بعد بہت مقبول ہوئی تھیں۔ کیفی اعظمی کی خامشی بہت عرصے کے بعد ٹوٹی ہے، اور ادھر انکی بھی بڑی اچھی نظمیں رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ انکے علاوہ وحید اختر، شاذ تمکنت بلراج کومل، باقر مہدی، شہاب جعفری، معصوم رضا راہی نے بھی بہت اچھی نظمیں کہی ہیں۔ انکے ہاں تازگی، فکر انگیزی اپنے آپ کو دریافت کرنے اپنے اور دور کے حقائق کا فن کارانہ ادراک کی کوشش ملتی ہے۔

ہمارے ہاں نثر میں نظم کی طرف بھی خاصی توجہ ہوئی ہے۔ سجاد ظہیر کا پگھلا نیلم، اس صنف کا پہلا مجموعہ تھا اس کے بعد بہت سی نثری نظمیں آئیں مگر ابھی تک اردو کے Ethos میں وہ اس

طرح شامل نہیں ہوسکیں جیسے آزاد اور معرا نظم۔

اس دور کی نظم نے اس وہم کو توڑا کہ ایمائیت صرف غزل ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور نظم میں شاعر چونکہ اپنے خیال کا بے محابا اظہار کر سکتا ہے۔ اس لئے اسے ایسے سہاروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس دور کے شاعروں کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نظم کی اپنی ایک الگ دنیا تعمیر کی۔ چناں چہ آج اقبال کی وضع کی ہوئی علامتوں یا جوش کے گرجتے ہوئے الفاظ کو جمع کر کے ایک اچھی نظم کہنا ممکن نہیں۔ آج کے شاعر کو اپنی فکر اور اپنے تاثر پر اعتماد ہے۔ اور اسی بنا پر نئے پیکر تراشنے نئے Images تخلیق کرنے اور نئے الفاظ اور نئی علامتوں کا چھپا ہوا نغمہ دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آج کی نظم کا نیا فنی کردار اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ آج شاعر اشیاء اور مظاہر کے نئے رشتوں اور انسانی زندگی پر ان کے عمل اور ردعمل سے وجود میں آنے والے اثرات کا نیا عرفان وادراک حاصل کرنے کا حوصلہ اور صلاحیت رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں ندا فاضلی کی ایک مختصر نظم کچی دیواریں پیش کروں گا۔ بدلتے ہوئے نظام میں پرانے نظام کو سہارا دینے والی فرسودہ قوتوں کا رول مگر تبدیلی کا اٹل اور ناگریز ہونا اس نظم کا موضوع ہے۔ پرانی تنقیدی زبان میں یہ ایک خارجی موضوع ہے مگر شاعر نے اسے خارج سے تھوڑی دیر کے لئے جدا کر دیا ہے۔

میری ماں ہر دن اپنے بوڑھے ہاتھوں سے ادھر ادھر سے مٹی لاکر
گھر کی کچھ دیواروں کے زخموں کو بھرتی رہتی ہے
تیز ہواؤں کے جھونکوں سے
بیچاری کتنا ڈرتی ہے۔
میری ماں کتنی بھولی ہے
برسوں کی سیلی دیواریں
چھوٹے موٹے پیوندوں سے
آخر کب تک رک پائیں گی؟
جب کوئی بادل گرجے گا

ہر ہر کرتی ڈھ جائیں گی۔

یہ اس قسم کی بہت سی نظموں کا پچھلے چند برسوں میں وجود اردو نظم میں ایک نئے اور خوشگوار رجحان کی نشان دہی کرتا ہے۔ شاعر جو کہ سماج کے متوسط اور نچلے طبقے سے ابھر رہے ہیں تو ان کی زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ نظم کے موضوعات میں پہلے کے مقابلے میں وسعت پیدا ہونا لازم ہے۔ لہٰذا فصاحت و بلاغت زبان د بیان شاعری کے اصولوں اور نوعیت پر غور کرتے وقت ہمیں اس حقیقت پر بھی نظر کرنی ہوگی کہ یہ شاعر کل کے نہیں بلکہ آج کے پڑھے لکھے طبقے سے آ رہے ہیں۔ جس کے ذہن کی تربیت میں فارسی کا حصہ نہیں ہوتا اُن تک فارسی روایت کی رمق اردو شاعری کے ذریعہ ہی سے پہنچی ان کے ذہن کی تربیت میں اس سے زیادہ اس کا حصہ نہیں۔ وہ آج انگریزی ہندی اور مقامی ہندوستانی زبانوں سے زیادہ متاثر ہیں چنانچہ ان کی زبان پہلے کی زبان سے مختلف ہے۔

بری شاعری ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے۔ برے شاعروں کی دنیا کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ کوئی چاہے تو افلاطون بن کر انھیں اپنی مثالی ریاست سے نکال کر بھی دیکھ لے وہ بری شاعری پھر بھی کرتے رہیں گے۔ مگر اپنے زمانے میں جب ہر شے تحلیل ہو رہی ہو، بنے بنائے ٹھوس سانچے ان دیکھی حرارت سے بے اندازہ تیزی کے ساتھ پگھل رہے ہوں تو یہ خطرہ اور بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ آج یہ خطرہ پہلے سے زیادہ ہے۔ آزاد نظم کی مقبولیت نظم میں جرأت فکر اور آزادی اظہار کے نئے امکانات با معنی تجربات کے ذریعہ اور تخلیقی فکر کی آزمائش کا پیمانہ سمجھے جانے کے بجائے کم مایہ اور کور ذوق شاعروں کے ہاں ہر طرح کی چھوٹ اور دنیا بھر کی خرافات کی اجازت سمجھ لئے جاتے ہیں۔ اس قسم کی چیزوں کو شاعری صرف اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بعض رسائل میں اتفاق سے نظم کے صفحات پر چھپ جاتی ہیں۔ شاعری کے اس حصے پر شاعری کے ذیل میں نہیں ''پرنٹنگ پریس کی ایجاد کے نقصانات'' کے ذیل میں غور کیا جانا چاہئے۔ اس لئے ہم یہاں نظر انداز کرتے ہیں۔ آج کی شاعری کی زبان بزرگوں کے کہنے کے مطابق تو سراسر غلط اور بگڑی ہوئی ہے مگر یہ آج کی اکثریت کی اردو ہے۔ جس کی بنیاد گلیوں بازاروں اور بے تکلف محفلوں میں پڑی ہے۔ لہٰذا آج کے شاعر سے فنی اعتبار سے ان معیاروں کا تقاضا کرنا بے کار ہے جو ہمارے بزرگوں نے

وضع کئے تھے۔ آزاد نظم کی روایت مصرعوں کا ٹوٹنا الفاظ کی نشست اور ان کا محل استعمال اور تراکیب کی چستی غرض کہ ان سب فنی نزاکتوں کو پرکھنے کے لئے نئے معیار بنانے ہوں گے۔ جو آج کی بول چال کی زبان اور اس ادب سے اخذ کئے جائیں گے جو آج کے شاعر اور ادیب کی تخلیق ہیں۔

(آج کل ۱۹۶۵ء)

انحراف کی شاعری

نئی نظم اب اعتبار حاصل کر چکی ہے۔ ایک وقت تھا جب اس کے نئے پن میں ایک چونکا دینے والی بات تھی، جو اب نہیں رہی بلکہ وہ آج کے ادبی ماحول میں رہنے والوں کی ایک عادت بن چکی ہے وہ اس عہد کی روایت کا حصہ ہے جو آزمایشوں کے دور سے کامیاب گزرنے کے بعد خود اپنے معیار متعین کر رہی ہے۔ اسی لیے اب نئی نظم کو نئے پن کی وہ چھوٹ نہیں دی جا سکتی جو اسے ابتدا میں ملی۔ نئی چیزوں کو شروع میں نظر انداز بھی کیا جاتا ہے اور رد بھی۔ نئی نظم کے ساتھ بھی یہی ہوا مگر آج وہ ان سب مراحل سے گزر کر اس منزل پر ہے کہ اپنا کھوٹا کھرا خود طے کر سکے۔

نئی نظم کا قاری بھی ادبی روایت اور عصری زندگی کے تقاضوں کا ادراک رکھتا ہے اور تخلیق کار کے ساتھ عصر حاضر کی ادبی سرگرمی اور فضا سازی میں برابر شریک ہے اسی لیے آج کی نظم کا شاعر اور اس کا قاری ایک دوسرے سے زیادہ سے قریب ہے۔ شاعر کی سرگوشی ہو یا خود کلامی اپنے لہجے اور الفاظ کے آہنگ سے ایسی فضا پیدا کرتی ہے کہ ہم خود اپنی تنہائی کے لمحوں میں کسی آشنا آواز کا رس یا کرب محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی خاموشی بھی سننے لگتے ہیں۔ نئی نظم کی یہ صفت ماضی کی اس نظم سے مختلف ہے جہاں شاعر محفل یا مجمع عام سے مخاطب تھا اور ہر نظم بہ آواز بلند اور سب کو لبھانے والے ترنم سے پڑھی جا سکتی تھی بلکہ اچھی نظم کا ہر مصرع تو اسی کا تقاضا کرتا تھا۔ آج کی نظم کا اندرونی ترنم اسے خارجی وسائل کا اس قدر مرہون منت نہیں بناتا۔ اسے اپنے آپ پر بھروسہ ہے۔ اس فضا کے پیچھے یہ نفسیات ہے کہ ہم سب ایک جیسے نہیں۔ نہ شاعر نہ قاری، ان سب کے فکر و احساس اور اس کے تقاضے الگ الگ ہیں مگر وہ کسی ایک نقطے پر مل بھی سکتے ہیں۔ آج کا شاعر گویا ایک private person جس کی تخلیق بھی private person کے لیے ہی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ اردو کی صدیوں پرانی روایت سے انحراف ہے جسے آج کی زندگی کی بے چینیوں نے جنم دیا ہے۔

ہم یہاں ذرا ٹھہر کر اب روایت کی حقیقت کے بارے میں بھی غور کرتے چلیں تا کہ انحراف

کی نوعیت بھی واضح ہو۔ زندگی کوئی بے چینیوں کی بنا پر سماج کا فرد فرد ہو جانا اور اردو شاعری میں تنہائی، بیگانگی وغیرہ کی بنا پر خاص قسم کی تخلیقات کا ظہور میں آنا اردو شاعری کے تہذیبی تناظر کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ آج کی زندگی میں خصوصاً نئے شہروں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں کہ بہت کچھ پہلے لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ چنانچہ نئے شاعر اور اس کی شاعری پر اس کے اثرات میں بھی کلام نہیں، ایک شاعر ہی کیا ہم سب آج اس صورت حال سے نبرد آزما ہیں مگر کیا آج کی زندگی کا بس یہی ایک اہم پہلو ہے یا اردو کے نئے شاعر کا اپنا بھی کوئی ایک مخصوص کردار ہے جو دوسری زبانوں کے نئے شاعروں سے مختلف ہے۔

انحراف کی حدیں

ہماری تہذیب میں محفل، بزم، منڈلی، چوپال جیسے سماجی ادارے صدیوں سے وجود رکھتے تھے اور آج بھی سب کچھ بدل جانے کے باوجود ان میں سے بہت کچھ باقی ہے۔ اور فن کار خود کو ان معنوں میں تنہا محسوس نہیں کرتے تھے جن معنوں میں آج اس کا ذکر ہوتا ہے اور کچھ ضرورت سے زیادہ ہونے لگا ہے۔ اس طرح کے سماجی نظام میں ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ اس قدر سنجید نہیں تھا۔ تخلیق کار اور اس کے سامعین یا ناظرین کی عموماً بلا واسطہ شرکت سے مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات تو تخلیق میں مجمع کا حصہ بھی ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ ہندستان کے لوک کلچر کی دین تھی جو اشرافیہ کے یہاں بھی در آئی تھی۔ جس کی بے شمار مثالیں ہمارے ہاں مل سکتی ہیں۔ اردو تہذیب میں محفل یا بزم میں نشو و نما پانے والے مراختے اور مشاعرے کا ادارہ اسی کی ایک شکل تھا۔ ہماری آج کی تہذیب میں سب چیزیں مکمل طور پر تو نہیں بدلیں (جتنی مثال کے طور پر مغربی ممالک میں بدل گئی ہیں) مگر شہروں کی زندگی میں فروغ پانے والے متوسط طبقے میں یہ اقدار تیزی کے ساتھ ٹوٹ رہی ہیں۔ بلکہ بہت کچھ تو ختم ہو چکا ہے۔ اردو شاعری کا یہ ایک اہم سماجیاتی پہلو ہے۔ شہر اور شہر کے تہذیبی تناظر میں اس کا خمیر اٹھا ہے۔ اس کے فروغ میں بھی اسی کا دخل رہا ہے۔ دیہاتوں اور قبائلی علاقوں میں ملنے والے لوک کلچر کے اثرات اردو شاعروں میں بڑے منقّح کے بعد نتھر کر پہنچے ہیں۔ فارسی شعریات، مغربی ایشیائی اور وسط ایشیائی عناصر سے اردو زبان و ادب کا رشتہ ہندستان کے شہروں کے اشرافیہ میں بھی فروغ پا سکتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ زبان کی مقامی جڑیں بھی اسے اپنی

قوت عطا کرتی رہیں۔ چنانچہ فارسی شعریات میں مقامی ضرورتوں کے مطابق کتر بیونت اور قلم لگنے کا کام خاموشی کے ساتھ فطری طور پر ہوتا رہا۔ زبان کی سطح پر عمل زیادہ جاندار اور معنی خیز رہا کہ زبان جو یہیں جنمی اور گلیوں بازاروں میں پرورش پاتی رہی) ہمیشہ زمین سے لگ کر ہی چلتی ہے مگر اردو شاعری پڑھے لکھے اور خوش حال طبقے کی میراث تھی اس لیے روایت اور معیار پرستی کی سخت گیری نے اس کی رسائی سماج کی نچلی سطح تک نہ ہونے دی اور نہ اس سطح پر پلنے والے زیادہ تر عناصر اس کے حضور میں بار پا سکے۔ میر کی زبان اور طرز کتنا ہی سادہ اور انوکھا ہو اور نظیر کے پاس زبان کے ساتھ ساتھ موضوعات کا کتنا ہی متنوع خزانہ کیوں نہ ہو ان کی جڑیں بھی دلی، لکھنؤ اور آگرے کی شہری زندگی میں ہی تھیں۔ یقیناً فارسی کے اثر کو منفی یا غیر ہندستانی نہیں کہا جا سکتا کہ اس عہد میں ہند ایرانی تہذیب اور تاریخ کا تقاضا تھا، فارسی ادب سے اس عہد میں اردو کا استفادہ کرنا اتنا ہی حقیقی، لازمی اور حیات بخش تھا جتنا کہ مغرب سے رابطہ قائم ہونے کے بعد انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں سے استفادہ۔

چنانچہ آج کی اردو شاعری کی زبان وہی شہری زبان ہے جو صدیوں کے ارتقا کے بعد آج کی منزل میں پہنچی ہے اور ہمارے شاعر خواہ وہ میر و غالب و اقبال ہوں، یا فیض، میرا جی، راشد اور اختر الایمان یا ان کے بعد کے شعراء سب کی زبان اور شاعری ایک خاص سطح کے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہے اور اسی لیے ساری اردو شاعری کی طرح ہماری آج کی شاعری کا دائرہ بھی محدود ہے۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر ایسا تو اردو شاعری آج ہندستان میں اتنی مقبول کیوں ہے۔ فلم ہو، ٹی وی ہو اور دہلی، لکھنؤ، بمبئی، حیدرآباد جیسے شہروں کی عام محفلیں ہوں یہاں تک کہ پارلیمنٹ کے مباحثوں تک کو لے لیجیے اردو شاعری کا جادو ہر جگہ چل رہا ہے۔ اس کا دائرہ اثر یہاں سے وہاں تک آخر کیسے پھیل گیا؟ یہ وہی ہند ایرانی تہذیب کا ملک گیر پھیلاؤ ہے جس کے مراکز پہلے بھی شہر تھے اور آج بھی شہر ہیں۔ دور وسطی سے ہندستان کے مختلف لسانی علاقوں کے درمیان رابطے کی زبان اردو ہی بنی تھی۔ اردو دہلی اور اسی کے نواح میں نشو و نما پانے والی زبان تھی، راجدھانی کی تہذیب کے ساتھ ملک گیر اعتبار حاصل کر چکی تھی۔ ہر علاقے کی تہذیبی اقدار کو کسی نہ کسی حد تک جذب کرتے ہوئے اردو نے سب کے درمیان ایک رشتہ قائم کیا۔ آج ہندستان کا شاید ہی کوئی خطہ ہو جہاں اردو کے ایسے مسودات اچھی خاصی تعداد میں نہ پائے جاتے ہوں جو کسی نہ کسی زمانے میں وہاں

ظہور میں آئے مگر یہ سب کچھ شہروں تک محدود رہا۔ یہ روایت ایک غیر معمولی تسلسل کے ساتھ آج بھی چلی آتی ہے اور آج کی شاعری بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔

یقیناً آج کی اردو شاعری میں دیہات کا ذکر ملتا ہے جو پرانی شاعری میں نہیں تھا مگر شاعر کے رومانی تخیل کا پروردہ دیہات ہے۔ برسات کی بہاریں ہرے بھرے کھیتوں کی لہلہاہٹ، افق تک پھیلے ہوئے فطرت کے رنگ، پن گھٹ پر پنہاریوں کے جم گھٹے سب کچھ اردو شاعری میں ہیں اور بہت خوبصورت ہیں۔ مگر آج شاعر کا سب سے بڑا دکھ اس رومان کے ٹوٹنے، ان فضاؤں کے زہر آلود ہونے اور زمینوں کی مشین زدگی کا ہے اس کی بھولی بسری زندگی کی یادوں کا حوالہ یہی دیہات ہے۔ یہ دیہات پریم چند کے گئودان اور کفن کا دیہات نہیں۔ اردو شاعری اردو فکشن کے دیہات ہے۔ یہ دیہات میں اتنا بڑا فاصلہ کیوں؟ ترقی پسندوں کے یہاں بھی شاعری اور فکشن اس اعتبار سے ایک دوسرے سے دور رہے ہیں۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا اقبال اور پریم چند الگ الگ زبانوں کے شاعر ہیں؟ فیض جس کسان کی بات کرتے ہیں وہ کسی اور دیس کا ہے اور بیدی کے پنجاب کا گاؤں کہاں سے آ گیا۔ اقبال جب کہتے ہیں۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

تو یہ پریم چند کے لہجے سے کتنا مختلف ہے۔ یہ دہقاں نہیں۔ ایک ہمدرد اور باشعور دانشور ہے جو دیہات کو لاہور سے بیٹھ کر دیکھ رہا ہے۔ اختر الایمان کی سوانح میں جو دیہات ہے وہ ان کی شاعری میں ہے مگر کس قدر؟ ایک لڑکا، جس دیہات میں گھومتا پھرتا تھا وہ کتنا خوبصورت رومان انگیز تھا، دراصل پریم چند کے ساتھ حقیقت پسندی کی لہر نے فکشن کو زیادہ متاثر کیا جبکہ شاعری پر رومانیت ہی غالب رہی اور پھر فکشن میں بھی تناسب کے اعتبار سے شاعری کے مقابلے میں دیہات کا اصل روپ زیادہ صحیح مگر مجموعی اعتبار سے کم ہے اور دوسری زبانوں کے مقابلے میں تو ہمارے فکشن میں یہ پہلو یوں بھی کم تر۔

اب ہندستان کی دوسری زبانوں کی شاعری پر بھی نظر کیجیے۔ ٹیگور اور نذرل کی شاعری بنگال کے پڑھے لکھے طبقے تک محدود نہیں، وہ شہروں اور دیہاتوں کے ہر گھر کا تہذیبی اثاثہ ہے جو دن رات وہاں کی فضاؤں کو شاداب رکھتا ہے علاقائی زبانوں کی شاعری اور اردو شاعری کا بنیادی فرق سماج کے

مختلف طبقوں تک رسائی کا ہے۔اردو کا دامن جغرافیائی اعتبار سے سب زبانوں سے زیادہ وسیع ہے۔ مگر وہ کسی علاقے میں بھی اندرونی تہوں تک نہیں پہنچ سکی۔ایک زمانے میں اپٹا نے ادب کو اسٹیج سے جوڑ کر سماج کے سب سے پچھڑے علاقوں اور طبقوں تک جانے کی کوشش کی تھی مگر اس کے لیے خاص قسم کی شاعری درکار تھی جو اپٹا کسان مزدور تحریک کے کلچر محاذ کے لیے لکھوائی جاتی تھی۔مگر اردو شاعری کے عام کلچر میں وہ جگہ نہ بنا سکی، اس پورے تجربے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری خواہ کلاسیکی اور رومانی ہو یا ترقی پسند یا جدید یا مابعد جدید روایت معیار کا بوجھ اٹھائے ہوئے سجل اور ہموار راستوں پر چل کر تو ضرور کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے مگر دیس کے اوبڑ کھابڑ راستوں پر اس کا گزر نہیں اور اسی لیے اس کی رسائی بھی وہاں تک نہیں جہاں صرف ایسے ہی راستے لے جاتے ہیں۔اردو شاعری کی یہ صفت اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے یہاں روایت سے بغاوت اور اس کے زیر اثر بننے والے معیاروں سے انحراف ایک دائرے کے اندر ہی رہا ہے۔اس دائرے کی حدیں صدیوں کی تاریخ کی بنائی ہوئی ہیں۔اسے ہمارے یہاں کوئی بھی آج تک نہ توڑ سکا۔مستقبل اردو نظم کے تخلیق کاروں کو کس سمت لے جائے گا اس کا بہت کچھ انحصار آنے والے فن کاروں کے انفرادی تخلیقی مزاج اور caliber پر ہے مگر آج نئی نظم کے انحراف کو ان ہی حدود کے اندر دیکھنا ہوگا۔

انحراف کی نوعیت

آج کی شاعری کا ماضی سے انحراف ہمیں اس کے لہجے میں ملتا ہے۔زبان اور اظہار میں بہت سے نظم نگاروں کے انداز کو اردو کے روایتی معیاروں کے عادی لوگ غرابت بلکہ کھر اپن کہیں گے جو آج کے شاعر کے نقطۂ نظر سے کوئی خامی نہیں بلکہ ایک طرز ہے جسے اس عہد کی زندگی نے بنایا ہے۔دراصل پرانے معیاروں پر نئی نظم کا جانچنا بھی صحیح نہیں مگر قارئین کے حلقے کو صرف نئی نظم کے پڑھنے والوں اور پرانی شاعری کے پسند کرنے والوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، تبدیلی آتی ہے تو وہ پرانوں کو بھی نئی طرز سے ساز کرنے یا کم سے کم نئے لوگوں کے نقطۂ نظر کو برداشت کرنے پر بھی رضامند کر لیتی ہے۔ چنانچہ ادب کو پسند کرنے والا حلقہ تغیرات سے گزرتا ہوا خود بخود نئے معیاروں پر استناد کی مہر لگاتا چلتا ہے جو ایک خاموش اور ان دیکھا عمل ہے۔غزل کے زیر اثر مدتوں ذہنی تربیت پانے کے سبب اردو والے آہنگ وزن اور Symetry کا خاص مذاق رکھتے

ہیں اور الفاظ کے انتخاب اور ان کی تراش خراش بھی ذہنوں پر ایک خاموش جبر کی طرح روایت نے نافذ کیا ہے۔ چنانچہ عام طور سے مستعمل زبان اور شاعری کی زبان میں آج بھی ایک فاصلہ ہے غلط العام کو تو گوارا کیا جاتا رہا ہے مگر غلط العوام تک آنے کی ہمت کم کم ہی ہوتی ہے اگر چہ کل کا غلط العوام آج غلط العام ہوتا چلا جارہا ہے۔ نئی نظم کا شاعر اس معیار پرستی سے بھی انحراف کرنا تو ضرور چاہتا ہے مگر ابھی یہ بات عمومی طور پر سب شاعروں کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی۔

ایک لفظ و معنی کے گورکھ دھندے کی طرف آج کے شاعر کا رویہ بھی اہم ہے۔ اب معنی آفرینی کی جگہ فضا آفرینی نے لے لی ہے۔ نظم کا پورا آہنگ ایک اکائی کی شکل میں آتا ہے۔ مصرعوں اور ان کے اندر الفاظ کی دروبست کا رشتہ ایک بڑی وحدت سے ملائے بغیر نہ الفاظ کو سمجھا جاسکتا ہے نہ نظم کے مفہوم کو، مفاہیم اور تلازمات کی جگہ مجموعی صوتی تاثر اور نظم کی اندرونی ساخت میں علامتوں، استعاروں اور تمثالوں کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اب نظم کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے پرانے انداز بے کار ہو چکے ہیں۔ نظم کو سمجھنا نظم سے تسکین یا اضطراب حاصل کرنے کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ شاعر اور اس کے قاری کے درمیان ترسیل کے لیے انفرادی موڈ اور کیفیت درکار ہے۔ اگر نظم اس کیفیت کو پیدا کر سکے تو وہ کامیاب ہے ورنہ نظم کے ساتھ شاعر اور قاری بھی ناکام۔

ہماری نئی نظم کے شاعروں کے ہاں میراجی، راشد اور ان کے بعد اختر الایمان ماڈل رہے ہیں۔ بے شک وہ ہر حساس شخص کو اس کے اپنے مذاق کے مطابق الگ الگ ایک گہرا داخلی انسپریشن، دل و دماغ کو کبھی تسکین کبھی اضطراب عطا کرتے ہیں۔ اس کے تخلیل کو مہمیز کرتے ہیں کسی شے، کیفیت یا صورت حال کے بارے میں اپنے انداز سے آگہی فراہم کرتے ہیں لیکن اگر ماڈل کا وجود انسپریشن لینے والوں کے لیے زنجیر بن جاتے ہیں، انھیں کسی اقلیم کی آخری حد مان لیا جائے اور اپنے اندر جستجو کرنے کی بجائے ان کے بنائے ہوئے طرز پر انحصار کیا جائے تو وہ ماڈل کتنے ہی اہم ہوں ان کے رعب کے اثر والی شاعری کسی نہ کسی منزل پر سکڑی سہمی سی لگنے لگتی ہے۔ بدقسمتی سے نئی نظم پڑھتے وقت اکثر احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے بڑے ماڈلوں کے حصار سے آزاد نہیں ہوسکی۔ نکلنے کی کوشش تو ہے پھر بھی ماڈلوں کا وجود نہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ کسی بھی عہد اور زبان کے بڑے شاعروں کا یہ رول، جس کے وہ خود ذمہ دار نہیں پوری تخلیقی فضا پر اکثر منفی اثر ڈالتا ہے۔ میر، غالب، اقبال کی عظمت تسلیم مگر ان کی لیکھ پر چلنے والے بہت

آگے بڑھے تو بس ٹھیک ٹھاک قسم کی شاعری ہی کر سکے۔ بڑے شاعروں کو دیوتا بنانے میں تنقید کا بھی کچھ نہ کم دخل نہیں۔ بلکہ میرے خیال میں تو سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارے عہد میں مرعوبیت کا سبب وہ تنقیدی فیصلے ہیں جن میں حد سے زیادہ ادعائیت ملتی ہے۔ پھر تحریک اور تحریک شکنی کے جوش نے بھی ہمارے ہاں اپنی لہریں چھوڑی ہیں، ترقی پسندی کے عہد کی خوبیاں اور خامیاں جو بھی ہوں ان سے آزاد ہونے کی کوشش اتنی آسان نہ تھی۔ چنانچہ ماڈل تو وہ رہے جو ترقی پسندی کے عہد میں ایک عرصے تک ترقی پسندی سے قریب رہنے کی مقبولیت اور براعظم کے سیاسی حالات نے فیض جیسے شاعروں کو ان کے عہد میں نمایاں کر دیا، وہ لوگ عرصے تک مضمحل رہے۔ میراجی اور راشد کے یہاں ان کی تمام تر خوبیوں کے باوجود ترسیل ایک مسئلہ تھا۔ یہ طرز صرف ان لوگوں کے لیے ہی آسان تھا جن کا ادبی مزاج ایک خاص سطح رکھتا تھا۔ فیض کے کلاسیکی ڈکشن نے خواہ اس میں انقلاب کی باتیں کی گئی ہوں انھیں روایت سے قریب ہونے کی بنا پر اردو قارئین کے بڑے حلقے سے بہت قریب رکھا۔ ان لوگوں کو بھی ان کا گرویدہ بنا دیا جو ان کے سیاسی مسلک کے سخت خلاف تھے۔ پھر ''تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار'' ہونے کی بنا پر ان کی شخصیت کے گرد بھی ایک رومانی ہالہ بن گیا جو دوسروں کے یہاں نہ ہو سکا۔ اختر الایمان جن کے بارے میں تنقید ایک عرصے تک زیادہ تر خاموش رہی۔ خواہ وہ ترقی پسند تنقید ہو یا جدیدیت کے حامی۔ اختر الایمان ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ ابھرے تھے۔ سیاسی اور سماجی نظریے کے اعتبار سے بھی ان کی نثری تحریریں اور شاعری دونوں ترقی پسندی کے بہت قریب ہیں مگر ترقی پسند تنظیم انھیں اور وہ ترقی تحریک کو بجا طور پر گوارا نہ کر سکے کہ ان کی تخلیقی شخصیت لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہونے والے سیاسی فیصلوں کی تابع نہ ہو سکتی تھی جس کے لیے تنظیم بھی مجبور تھی اور تنظیم سے وابستہ شاعر بھی۔ چنانچہ فیض کے مقابلے میں جدیدیت کو جب اپنے پیغمبر کی تلاش ہوئی تو وہ انھیں اختر الایمان کی صورت میں مل گیا۔ اگر چہ اختر الایمان اس پورے عہد میں ہمیشہ موجود تھے۔ رسائل اور مضامین میں ان کی اہمیت کا اندازہ پچھلے چند برسوں میں ہوا، اردو تنقید کی خاموشی کے باوجود وہ ہمیشہ اہل مذاق کی محفلوں میں اس عہد کے سب سے اہم شاعروں میں مانے جاتے رہے۔

آج کی نظم زندگی کی سچائیوں کا ادراک و اظہار جس طرح غیر رومانی انداز میں کرتی ہے وہ پہلے کبھی نہ تھا، وہ کلاسیکی ضابطوں کو بھی بڑی حد تک توڑ چکی ہے مگر پھر بھی وہ ابھی تک اس عظمت

سے محروم ہے جو کلاسیکیت اور رومانیت نے اپنے شاعروں کو عطا کی تھی۔ ترقی پسندوں نے کلاسیکیت اور روایت کو چھوڑنے کی بجائے اسے سہارے کے طور پر استعمال کیا تو روایت کے تسلسل کو قائم رکھنے کا پورا فائدہ بھی پایا۔ بعد کی نظم کی یہ صفت تو یقیناً مبارک ہے کہ اس کے کلاسیکی اور رومانی روایت پر تکیہ کرنا چھوڑ دیا۔ تکیہ کے سر کے نیچے سے سرک تو گیا مگر اس کے بعد سر جتنا اونچا ہونا چاہیے تھا وہ کیوں نہ ہو سکا۔ شاید اس لیے کہ اسی زمین جو کچھ ہے ابھی تک اپنے عہد کی زندگی اور زمین سے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنی جڑیں نہ پھیلا سکی کیوں کہ جڑوں کی آبیاری کے لیے مثال کے طور پر ہمارے ملک کے مختلف علاقوں کے لوک ادب، سنگیت، لوک ناٹک سے اور علاقائی زبانوں کے رویے سے جو کچھ سیکھا جا سکتا تھا اس سے بہت زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ جدید شاعر بہت اونچے مرمریں میناروں پر بیٹھا ہے اور وہ مینارے اور بھی اونچے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ شاعری جب تک اسی زبان کے عام بولنے والوں کی (نقادوں اور شاعروں کی نہیں) تہذیب کا جزو نہ بن جائے وہ عظمت سے محروم رہے گی۔ خصوصاً وہ شاعری جو ماضی سے انحراف کرتی ہے۔ صرف تہذیب کی ضامن اور نئے پن کا کرب واضطراب ہی نہیں بلکہ اس کی سرمستی اور مسرت کس حد تک جذب کر سکی، کہا جا سکتا ہے کہ آدرش اور نظریے جو مستقبل کا خواب دکھاتے تھے سرخوش وسرمست بھی رکھتے تھے۔ وہ اب کہاں! حالی کے یہاں اور ترقی پسندوں کے ہاں آدرش کے دیے ہوئے خوابوں کا نشہ ہے مگر میر و غالب کے ہاں کون سا آدرش یا نظریہ تھا۔ جس نے اتنی بڑی شاعری کو جنم دیا تھا ان کے یہاں تو اضطراب ہی اضطراب تھا اور وہ تو اقبال کے یہاں بھی تھا باوجود ان کے آدرش کے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نئی نظم پرانی نظم کی طرح غزل زدہ نہیں جسے یاد رکھا جا سکے گنگنایا جا سکے اور جو اپنے قافیوں اور ردیفوں کی کھنک اور اس کی بازگشت سے ذہنوں میں محفوظ نہ ہو کہ احساس، جذبے اور تجربے کی پائیدگی کی بدولت نئی نظم کی پوری شناخت پڑھنے والوں سے زیادہ سنجیدگی کا تقاضا کرتی ہے۔ پرانی نظم اپنی حدود کے باوجود احساس جذبے اور تجربے سے محروم نہ تھی نہ اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے کم سنجیدگی درکار تھی۔ پرانی نظم کے شاہکار آج بھی قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آیندہ بھی اردو شاعری کا اہم ترین ورثہ رہیں گے۔ ادھوری سچائیوں اور خود فریبوں پر مبنی مفروضات زیادہ دیر ساتھ نہیں دے سکتے۔ اور یہ رویہ نئی نظم کی رسائی کی خود بخود کم سے کم تر کرے گا۔ یہی حال ہمارے یہاں عالم گیر ادب سے انسپریشن کا ہے۔ ہم ہر سانس میں

بیرونی زبانوں کا حوالہ دیتے ہیں مگر ان زبانوں کا ذکر کبھی نہیں کرتے جو تاریخی اور تہذیبی طور پر ہم سے ہمسائیگی کا رشتہ رکھتی ہیں۔ عالم گیریت نے طرح طرح کے نفسیاتی جالے بنائے ہیں۔ برآمد کیے مال کے نتائج معاشی نقطۂ نظر سے کچھ بھی ہوں ادب کو تو یہ رجحان جعلی تحریروں کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔ نئی نظم اپنے انگریزی ترجموں میں کتنی ہی بھلی لگے اصل متن اگر پھسپھسا ہے تو اردو میں اس کی کیا وقعت ہوسکتی ہے۔ عالم گیر ادب میں وہی شاعری اہم قرار پائے گی جو اس زبان کی تہذیب کی نمائندہ ہوگی، نہ کہ اوپر سے اوڑھے ہوئے بیرونی فارمولوں کی۔ جنوبی امریک اور افریقہ کا ادب آج اگر دنیا میں اپنی جگہ بنا سکا ہے تو صرف اس لیے کہ اس نے عالمی ادب کو وہ کچھ دیا ہے جو پہلے نہیں تھا اور اگر تھا تو اس شان وشوکت کے ساتھ نہیں تھا۔ ہم لوگ ابھی تک نوآبادیاتی نفسیات سے پورے طور پر چھٹکارا نہیں پاسکے ہیں مغرب سے مرعوبیت ابھی ہمیں بسا اوقات اکبرآبادی کے بنائے ہوئے آئینہ خانے میں لے جاکر ہمیں اپنے آپ پر ہنساتی ہے۔ مختصر یہ کہ نئی نظم مغرب کے پیمانوں کو عالمگیر پیمانے تصور کرکے بڑی شاعری کو نہیں جنم دے سکی اسے خود اپنے اردگرد کی دنیا میں ہی اپنے آپ کو تلاش کرنا ہوگا اپنے اساتذہ سے انحراف سچی تخلیق کے لیے یقیناً لازم ہے مگر پھر سب طرح کے اساتذہ کو رد کیجیے۔ بے استاد اور بے پیرا ہونا اتنا برا نہیں جتنا کہ دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلتے رہنے کا عادی ہوجانا۔

نئی نظم کے شاعر کا کرب آج زندگی کا زائیدہ ہے۔ اس کے احساس وادراک کو سیراب کرنے والے سرچشمے عصر حاضر کے landscape میں ہیں۔ امیجری، علامت گری، استعارہ سازی سب ذہانت، نئی حسیت کا پتہ دیتے ہیں مگر پھر بھی نئی نظم اوسط درجے سے آگے تک نہیں جاسکی شاعری کی تڑپ کو جو بڑی سچی ہے اعلیٰ تخلیق میں ڈھلنے کے لیے جو ادھورے وسائل درکار ہیں جنھیں خود شاعر کی ذات فراہم کرتی ہے وہ شاید ابھی آدھے ادھورے ہیں۔ ذات اور عرفان ذات کا ذکر نئی شاعری سے متعلق گفتگوؤں میں خصوصاً تنقید میں خوب ملتا ہے مگر ذات کی صلابت اور ردو قبول کی وہ صلاحیت جو بڑے بڑوں سے لوہا لینے کی جرأت پیدا کرتی ہے جس میں علم وفن اور آگہی کی سمائی ہو اور ان سب کے علاوہ طلسم واسرار کی وہ ان دیکھی لہریں جو کہ ایک متحرک ذات کے اندر تڑپتی رہتی ہیں اس کا اب تک ظہور کم از کم نئی نظم کے ذریعے نہیں ہوا۔ نئی شاعری صرف ذات کے ورود پر مطمئن نہیں وہ ذات کے اندر صفات کی بھی منتظر ہے جو شاید ابھی نشو ونما سے گزر رہی ہوں۔

ترقی پسند تحریک کے نشیب و فراز

(غزل اور ترقی پسندی)

ترقی پسند تحریک بیسویں صدی میں اردو کی سب سے با اثر تحریک تھی اور گذشتہ پچاس برس میں ادب کے بارے میں کوئی بحث اس کے حوالے کے بغیر نہیں ہوئی۔ جب بھی ترقی پسند تحریک پر خود پرانے ترقی پسندوں یا نئی نسل کے ادیبوں نے تنقید کی یا اپنے عہد کے ادب پر اظہار خیال کیا تو زور عموماً اس بات پر دیا گیا ترقی پسندی سے کس کا کتنا فاصلہ رہا۔ بہر حال تاریخی اعتبار سے ترقی پسندی کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

ترقی پسند تحریک پر جو تنقید کی جاتی رہی۔ اس میں مندرجہ ذیل چند باتوں پر خاص طور سے زور دیا گیا۔

۱۔ ادب کی تخلیقی پیچیدگیوں اور اس کے جمالیاتی پہلوؤں کو کم اہمیت دی گئی۔

۲۔ خارجی عناصر کو ضرورت سے زیادہ اہم قرار دیا گیا۔ مثلاً سماجی، سیاسی، معاشی زندگی کے مسائل، قومی اور بین الاقوامی زندگی میں ہونے والی تبدیلیاں وغیرہ۔

۳۔ ادب کو پیغام رسانی کا راست اور خطیبانہ ذریعہ بنا دیا گیا۔ ادب تخلیق کار اور قاری کے درمیان صرف انفرادی رابطہ قائم کرتا ہے۔ جبکہ ترقی پسندوں نے مجمع عام کو خطاب کرنے کا فریضہ ادب کے سپرد کیا۔

۴۔ زبان، اصناف، ہیئت، پیرائیہ اظہار، شعریات وغیرہ کے اپنے تقاضے ہیں ہر فن کی

طرح ادب کا اپنا خود کار داخلی نظام ہے۔ جسے ترقی پسندوں نے نظر انداز کیا۔

۵۔ ادیب کے لئے نظریہ، سماجی وابستگی اور عوامی رابطہ لازم قرار دیا گیا۔

۶۔ کلاسیکی ادب کو جاگیردارانہ عہد کی یادگار فرسودہ اور نئے حالات میں غیر اہم قرار دے کر اہم اور مقبول اصناف اور مصنفوں کو نظر انداز کیا گیا۔

۷۔ زندگی کے ہنگامی موضوعات پر زور زیادہ گیا جب کہ سچے فن کا سرچشمہ ادیب کی اپنی ذات اور شخصیت کے اندر ہوتا ہے۔ ترقی پسندی نے ہنگامی موضوعات کو زیادہ اہم قرار دے کر ادیب کی آزادی کو سلب کر لیا اور جو ادب تخلیق ہوا اس کی حیثیت وقتی تھی۔ وہ زندہ رہنے والا نہیں۔ یہ اکہرا، سطح کے اوپر اوپر رہنے والا ادب ہے۔ اس میں گہرائی نہیں۔ جو دیر تک پڑھنے والوں کو کچھ سوچنے یا محسوس کرنے پر مائل کرے۔

ان ہی پہلوؤں کو ترقی پسندی کے زوال کا سبب بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں سچائی تو ہے مگر ادھوری۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خود ترقی پسندی کے عروج کے دور میں بھی ان پہلوؤں پر بحث ہوتی رہی اور ہنگامی اور ہیجانی ادب کے بارے میں سب سے اہم بیان خود سجاد ظہیر صاحب کا ہے:

''یہ ایک طرح کی ادبی دہشت انگیزی ہے۔ یہ ایک ذہنی
اور جذباتی بلوہ ہے جو ایک درمیانی طبقے کے انقلاب پرست کے
لئے ابتدا میں تو شاید جائز ہو لیکن ایک اشتراکی شاعر کو اس سے دور رہنا چاہئے۔
(خلیل الرحمٰن اعظمی: اردو میں ترقی پسند تحریک، انجمن ترقی اردو علی گڑھ،

اس میں شک نہیں کہ عملی طور پر ترقی پسندی کے زیر اثر اچھا برا، زندہ رہنے والا اور ہنگامی ادب سب ہی کچھ لکھا گیا۔ مگر انفرادی طور پر ہر اہم ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات میں مختلف اور دوسروں سے ممتاز ہے اور ان پر الگ الگ غور کرنا بھی لازم ہے۔ سب ایک تحریک سے تعلق رکھتے ہوئے بھی اپنی اپنی انفرادیت کی بنا پر اس وقت بھی مقبول ہوئے اور آج بھی نہ صرف مقبول ہیں بلکہ ان میں سے بعض لوگوں کے بارے میں بار بار لکھا جا تا رہا ہے۔ اور ترجموں کے ذریعے وہ ملک سے باہر بھی ہندوستانی ادب کے نمائندوں کے طور پر قبول کئے گئے ہیں۔

ہر بڑی تحریک کو اپنی مقبولیت کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی ہے۔ اس کے زیر اثر مقبول

ہونے والی تخلیقات کی بدولت ایک فارمولائی ادب بھی پنپنے لگتا ہے۔ تنقید کی پشت پناہی کے طفیل جو بربادیاں آئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر تحریک کے نقادوں نے اسطرح کے ادب کی پرورش کی ہے۔ کسان مزدور، انقلاب، سرخ سویرا وغیرہ کے ترانے ہوں یا بے چہرگی، بے گانگی، تنہائی، اندرونی کرب وغیرہ وغیرہ۔ انہیں جوڑ جاڑ کر اپنے اپنے وقتوں میں نظم یا کہانی ترتیب دینا اتنا ہی عام اور سہل تھا جتنا ساقی، شراب، زلف ورخسار، تصوف وغیرہ کو بحر اور قافیہ ردیف میں باندھ کر داد حاصل کر لینا۔ مضمون باندھنے کی روایت اردو شاعری کے خمیر میں ہے اور ہر عہد میں اسے اپنے اپنے مذاق کے مطابق برتا گیا۔

زندگی اور سماج کے مسائل سے آگاہی، راست اور خطیبانہ انداز ادب میں ہمیشہ نہ صرف رہے ہیں۔ بلکہ یادگار اور زندہ رہنے والے ادب کے محرک بھی رہے ہیں۔ ان کو ادب کی اقلیم سے نکال دینے کے معنی نظیر اکبر آبادی، انیس و دبیر، اکبر الہ آبادی اور اقبال کو بیک قلم خارج کر دینا ہے۔ اور ایسے اصول نافذ کرنا بھی ایک خارجی جبر ہے۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ محض ان عناصر سے ادب نہیں تخلیق کیا جا سکتا۔ پیرایۂ اظہار، اسلوب اور زبان کو برتنا تمام تر فن کار کے اختیار میں ہے۔ اس کے اس اختیار کو کوئی سلب نہیں کر سکتا۔ اصل اہمیت اسکی تخلیق کی ہے۔

غزل اور ترقی پسندی

ترقی پسند شاعروں کی غزل کو ایک طرح سے ترقی پسندی کی سوانح عمری کی ایک دستاویز بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں تحریک کے عروج وزوال کے تاریخی اور نظریاتی اسباب کے نشانات صاف نظر آتے ہیں۔ یہ بات کہ ترقی پسندوں نے ابتدا میں غزل کو ادب کے بہت سے کلاسیکی سرمایہ کی طرح جاگیردارانہ دور کی یادگار قرار دے کر اسے یک سرر دکر دیا، اس قدر عام ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ترقی پسندوں میں ایسے بھی تھے جنہوں نے کچھ عرصے تک اسے مان تو لیا مگر پھر اسی طرف واپس بھی آئے۔ غزل پر بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس کا پورا مزاج تصوف اور عشقیہ شاعری کی روایت میں ڈھلا ہے اس میں تشبیہات واستعارات کا نظام اس کا عام لہجہ ان جذبات واحساسات کا ساتھ نہیں دے سکتا جو نئی

زندگی کی دین ہیں۔ خصوصاً آزادی اور انقلاب کی جدوجہد اظہار کی جن بے باکیوں کا تقاضا کرتی ہے اس کے لئے اس صنف کا دامن بہت تنگ ہے۔ مغربی ادب کے زیر اثر اردو کے کچھ نقادوں نے تو غزل کو ترقی پسند تحریک سے پہلے بھی فرسودہ، بے ربط وغیرہ کہہ کر رد کر دیا تھا۔ چنانچہ فضا میں غزل کے خلاف ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں دونوں کی آوازوں کی بازگشت تھی۔ بہت اچھی نظمیں پہلے ہی سے ظہور میں آرہی تھیں پھر بھی غزل کی دلربائی میں کمی نہ آئی بلکہ مشاعروں، رسالوں، اور موسیقی کی محفلوں نے اس کی مقبولیت میں ہمیشہ اضافہ ہی کیا۔ غزل کا جادو یہ تھا کہ وہ اپنا روپ بدلے بغیر اپنے اندر اندر نئے امکانات کی دریافت کا چیلنج ہمیشہ دیتی رہی۔ ہر زمانے میں اس چیلنج کو قبول کرنے کو ہی اردو کے بہت سے اہم شاعروں نے اپنی فن کارانہ ہنرمندی کی آزمائش کا پیمانہ سمجھا۔

اردو ادب میں غزل ہی سب سے زیادہ مقبول صنف تھی، اس کے ذریعہ اپنا پیغام بڑے حلقوں تک پہنچایا جا سکتا تھا جو ترقی پسندوں سے قبل اقبال کر بھی چکے تھے۔ اقبال نے غزل کو بلند آہنگ اور خطابیہ لہجہ دے کر کلاسیکی تغزل کے زیرِ اثر تربیت پائے ہوئے اہلِ ذوق کے مزاج کو اپنے لہجے کا عادی بھی بنا دیا تھا، چنانچہ اس دور میں غزلیں بھی کہیں گئیں، مگر وہ غزلیں آج کی اصطلاح میں کچھ ''اینٹی غزل'' قسم کی چیزیں تھیں۔ وہ دور جب غزل میں اضطراری اور ہیجانی آوازوں کا شور وغوغا غالب آگیا تھا، سماجی اعتبار سے بھی ایسا ہی ہنگامہ خیز دور تھا۔ جلسے جلوس اور ریلیوں کا دور دورہ تھا۔ سیاسی ہنگامے نعرے، ہر طرف گونج رہے تھے۔ جب آزادی ملی تو ہندوستان تقسیم بھی ہوا اور درندگی وغارت گری کے تماشے دیکھنے میں آئے۔ آزادی کے خوابوں کے ساتھ پروان چڑھنے والا شاعر کا ذہن اب خوابوں کی شکست سے دوچار ہوا۔ اردو زبان کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا وہ بھی شاعر کے اضمحلال میں اضافہ کر رہا تھا۔ تلنگانہ کی جدوجہد جاری تھی۔ ترقی پسند جماعتوں پر قانونی پابندیاں تھیں۔ ان حالات کا فوری ردِعمل شدید ہوا اور دراصل اسی زمانے میں وہ غزل وجود میں آئی، جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک میں سرگرم شعرا کو تو جانے دیجیے، جگر جیسا شاعر اب غزل میں کہنے لگا:

جو محوِ جشن نظامِ نو ہیں پکار کر ان سے کہہ رہا ہوں
نچوڑتا ہے لہو غریبوں کا دستِ سرمایہ دار اب بھی

پھر جگر کو یہ احساس ہوا کہ یہ انداز غزل کا نہیں ہے، چنانچہ کچھ عرصے بعد یہی غزل ''آتش گل'' میں نظم کے طور پر شائع ہوئی۔ مگر اس وقت بھی انہیں یہ احساس تھا کہ:

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

چنانچہ ان کے آخری دور کی غزلیں رندی و سرمستی کی بجائے اسی انداز سے پہچانی جاتی ہیں۔ ایسے زمانے میں ترقی پسندوں کی یہ ادبی بے اعتدالی کوئی حیرت کی بات نہیں، تاریخ میں ایسے لمحات کا آنا لازم ہے۔ عناصر کے ایک توازن کو توڑے بغیر کوئی نیا توازن قائم نہیں ہوتا، اور اسی شکست و ریخت میں بے اعتدالیاں بھی ہوتی ہیں۔

ترقی پسند تحریک میں آزادی کے بعد نظریاتی اعتبار سے قطعیت اور ادعائیت کا دور تھا۔ انقلابِ روس کے بعد سوویت نظام کے استحکام اور پھر دوسری جنگِ عظیم میں اشتراکیت کی فتح، مزدوروں، کسانوں، دانش وروں اور طلبہ میں بائیں بازو کی قوت کے فروغ سے یہ نتیجہ نکالا گیا تھا کہ ہندوستان میں انقلاب کی راہیں متعین ہو چکی ہیں، اور لگتا تھا کہ انقلاب میں بس اب زیادہ دیر نہیں:

اک طرف روس، ادھر چین، ملایا برما
اب اُجالے مری دیوار تک آپہنچے ہیں

چنانچہ اُس متعین شدہ راہ کے حقائق کو نظم کر دینا جنہیں مارکسی مفکرین اور اہلِ سیاست بیان کر چکے تھے، کافی سمجھا گیا۔ اس عہد کا شاعر سچائیوں کی سطح کو چھوتا ہوا گزر جاتا ہے، اسی لیے زندگی اس غزل میں ایک لمحاتی اور اضطراری کیفیت بن کر رہ گئی ہے۔ یہ غزل جو بیانیہ اور خطابیہ نظم کی بس پرچھائیں تھی ترقی پسندوں کی طرف سے ایک رعایت تھی جو غزل کی روایت کو دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

ترقی پسند تحریک کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا سلسلہ ملک میں بائیں بازو کی تحریک کے اتار چڑھاؤ سے وابستہ رہا ہے۔ انقلاب کی راہ اتنی سادہ اور آسان نہ تھی جتنی کہ شاعر نے سمجھی تھی۔

انقلابی جدوجہد اس کی توقع کے مطابق آگے نہیں بڑھی تو اسے اپنی ذاتی شکست کا احساس ہوا، کیونکہ اس نے انقلابی تحریک اور اس کی ضرورتوں اور پابندیوں کو اپنی ذات سے الگ نہیں سمجھا تھا۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک اپنے آغاز کے دنوں میں ایک ایسی مقناطیسی قوت تھی جس کے سبب حساس ذہن اور دردمند دل خود بخود اس کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے۔ فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' اس عہد کے نئے شاعروں کے اسی احساس کی آئینہ داری کرتی ہے۔

ترقی پسندوں نے غزل کی زبان میں تبدیلی نہیں کی۔ کلاسیکی روایت نے جو رنگ روپ غزل کو دیا تھا وہی قائم رہا۔ مانوس الفاظ، استعارات، تشبیہات کے استعمال کے لیے معنوی اعتبار سے ایک ایمائی نظام بنایا گیا۔ جس کو سامعین اور قارئین کے لئے قابل مقبول بنانے میں کوئی مشکل اس لئے پیش نہیں آئی کہ آزادی کی جدوجہد کے دوران اردو فارسی شاعری کے اس نظام سے صحافت اور خطابت میں بہت پہلے سے فائدہ اٹھایا جارہا تھا۔ مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد اپنے مضامین اور تقاریر میں اردو کے پڑھے لکھے طبقے کو مخاطب کرنے کے لیے اشعار کا سہارا کثرت سے لیتے تھے۔ ہماری جذباتی زندگی میں شاعری کا سحر ہمیشہ اپنا کام کرتا رہا ہے۔ عاشق ومحبوب، زلف ورخ، دارورسن، دشت وصحرا، دیوانہ وفرزانہ، نوروظلمت، قطرہ ودریا، موج وساحل، واعظ وزاہد، مے ومیخانہ وغیرہ اپنی نئی ایمائیت کی بنا پر ہماری عام تہذیبی لغت کا حصہ پہلے ہی بن چکے تھے۔ چنانچہ ترقی پسندوں میں مجازؔ وجذبیؔ اور مجروحؔ، فیضؔ اور ان کے بعد سب ہی شاعروں نے اس شعری نظام کو اور مقبولیت عطا کی۔ ترقی پسند تحریک میں یوں بھی Communication ادب کی ایک بنیادی شرط سمجھی گئی تھی۔ یہ غزل مجروحؔ اور فیضؔ کے ہاں اپنے عروج پر ملتی ہے۔ آج بھی ان کے اشعار کی گونج فضا میں ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ اس طرح کی ایمائی شاعری پر ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ اسے اپنے اصل نظریاتی اور سیاسی وسماجی سیاق وسباق سے الگ کسی بھی نظریے کی تبلیغ کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جیسے کی کلاسیکی اردو اور فارسی شاعری کو صدیوں بعد آج بھی نئے نئے حالات پر منطبق کیا جاتا ہے۔ چنانچہ شعرا کا انفرادی لب ولہجہ بھی اس کی زد میں آجاتا ہے اور ایک شاعر کا کوئی شعر دوسرے کے نام سے بھی مشہور ہوتا رہا ہے۔ آج کی غزل جس میں کلاسیکی اور رومانی روایت سے شعوری طور

پر انحراف کی کوشش ماضی کی غزل سے مختلف ہے۔ پھر بھی غزل کی صنف کا یہ ایسا جبر ہے جس سے آزاد ہونا شاید ممکن نہیں۔

بہر حال ترقی پسند شاعروں کی غزل نہ صرف اپنے دور کے جذبات و احساسات کی فضا سے ہم آہنگ تھی بلکہ اس کا لہجہ اور روایتی استعارات و تشبیہات اور تلمیحات کی مقبولیت کی حدوں کی جو توسیع ہوئی اس کی بنا پر اردو میں غزل کے مجموعی سرمائے میں ایک وقیع اضافہ ہوا۔

ایک زمانے میں ترقی پسند غزل کا یہ انداز جن لوگوں کے نام سے پہچانا جاتا تھا ان میں مجازؔ، جذبیؔ، مجروحؔ پاکستان میں فیض احمد فیضؔ تھے۔ مجاز نے کہا۔

کیا تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

جذبیؔ نے بہت کم کہا۔ مگر پھر بھی اپنا ایک نقش چھوڑ گئے:

کوچۂ یار میں اب جانے گزر ہو کہ نہ ہو
وہی وحشت وہی سودا وہی سر ہو کہ نہ ہو
دل میں کچھ سوزِ تمنا کے نشاں ملتے ہیں
اس اندھیرے میں اُجالے کے سماں ملتے ہیں
آج بھی ریگِ بیاباں کے تپش زاروں میں
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے نشاں ملتے ہیں

مجروح نے جذبی سے بھی زیادہ کم کہا لیکن جو کچھ کہا وہ ترقی پسندی کے دور کی یادگار غزلوں میں سے ہے:

جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا
جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گُل اور گُل سے گلستاں بنتا گیا
روک سکتا ہمیں زندانِ بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

جب اشتراکی انقلاب نہ آیا تو ترقی پسندوں کے ہاں ایک گہری یاس آمیز سوچ، ایک ٹوٹتے ہوئے نشے کی سرگرانی، شدید پسپائی کا احساس اور کبھی کبھی تو اسے شکست نہ ماننے کا حوصلہ، غرض کہ سب ہی کچھ نظر آنے لگا۔

آخرِ شب کے ہمسفر فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی
فیض

ہجومِ دہر میں بدلی نہ ہم سے وضعِ خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے
مجروح

ڈھونڈو تو کچھ ستارے ابھی ہوں گے عرش میں
دیکھو تو وہ حریفِ شبِ تار کیا ہوئے
جذبی

راستے کی گرد نے دھندلا دیے منظر تمام
ورنہ ہم آوارہ گردوں کی نظر میں کیا نہ تھا
تاباں

اور سردار جعفری نے کہا:

خونِ سر بہہ گیا موت آگئی دیوانوں کو
بارشِ سنگ سے طوفانِ شرر سے پہلے

خلیل الرحمٰن اعظمی نے جو بعد میں تحریک سے الگ ہوگئے کہا:

جب نیند آگئی ہو صدائے جرس کو بھی
میری خطا یہی ہے کہ کیوں جاگتا ہوں میں

یہی وہ زمانہ ہے جب ترقی پسندوں نے غزل کی طرف پھر توجہ دی۔ اگر ایک طرف نظریاتی انتشار تھا تو دوسری طرف اس صورت حال سے لڑنے کی خواہش کا اضطراب بھی تھا۔ اب اظہار کی سطح پر ابہام اور ایمائیت ہی سہارا دے سکتی تھی، فضا علامتوں میں بات کہنے اور سننے کے لیے سازگار تھی، چنانچہ ترقی پسند شاعروں کو غزل میں اظہار کا ایک قابل اطمینان وسیلہ مل گیا۔ اب غزل میں شوو غوغا ختم ہوا۔ یہ غزل ترقی پسندی کے ایک پورے دور کے موڈ کی آئینہ دار ہے۔ جس کی اچھی نمائندگی مخدوم، جذبی، مجروح، تاباں اور جاں نثار اختر نے کی ہے۔

غزل کا یہ طرز پاکستان کے حالات میں فیض کو خاص طور سے راس آیا۔ وہ دارورسن کی منزل تک پہنچ کر واپس آئے تھے اس لیے ان کی شخصیت سے ان شعری استعاروں کی راست وابستگی نے بھی ایک گہرا جذباتی اثر پیدا کیا۔

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سر بلند کیا کرتے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گل چیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

یہاں جاں نثار اختر کا ذکر خاص طور سے ضروری ہے۔ ترقی پسندوں میں ان کے یہاں یہ تبدیلی بہت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اُن کا تخلیقی سفر دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرح رومانی نظموں سے شرع ہوا۔ پھر ترقی پسندی اور آزادی کی تحریک کے ساتھ اشترا کی خیالات کے غلغلے نے انہیں متاثر کیا اور اس دور میں انھوں نے سماجی اور معاشی بد حالی سامراجی غلامی جیسے موضوعات پر نظمیں کہیں۔ اور تحریک کے سرگرم اور مقبول شاعروں میں شمار کئے جانے لگے۔ ذاتی زندگی اور اس کے حادثوں اور سیاسی وسماجی حالات سے بے اطمینانی نے دھیرے دھیرے ان کے فکر واحساس کو چند سوالات سے دوچار کیا۔ انہیں لگا کہ جس سفر پر وہ نکلے تھے وہ انہیں کہیں بھی نہ لے جاسکا۔ ان کا مجموعہ، 'پچھلے پہر' اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں ان کی اس بے چین تخلیقی شخصیت کا پورا عکس نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار بھی اب ترقی پسندی کے دورِ عروج کی رجائیت لیے ہوئے نہیں بلکہ بے یقینی کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

یہ یاس آمیز فضا اُن کے ہاں پہلے اس شکل میں نہیں تھی۔ خاموش آواز اور خاکِ دل، آخری لمحہ آخری ملاقات اس عہد کی اردو شاعری کی چند ناقابل فراموش نظمیں ہیں اور آج بھی زندگی کی جدو جہد میں سرگرم ایک شاعر کی جذباتی زندگی کی جن کیفیات کو عیاں کرتی ہیں ان میں ہم اس پوری فضا کو محسوس کر سکتے ہیں جب ایک شکست نہ ماننے والی شخصیت پے بہ پے جذباتی اور فکری زندگی میں حادثوں سے دوچار ہوتی ہے۔ لیکن شاید اس وقت وہ فضا جو بعد میں جا کر ایک مکمل شکل اختیار کر لیتی ہے وہ بن رہی تھی۔ گھر آنگن، کی رباعیاں ان کی شاعری کو ہی نہیں اردو شاعری کو ایک بالکل نئی جہت سے آشنا کرتی ہیں یہاں ترقی پسندی سے کوئی انحراف نہیں بلکہ اس کا ایک روپ ہے۔ بدقسمتی سے اس قسم کی باتوں کی طرف ترقی پسندوں نے کم توجہ دی ورنہ خودنجی اور سماجی زندگی اتنی دولخت نہیں ہے جو ایک زمانے میں ترقی پسندوں کے ہاں نظر آتی تھی۔ سردار جعفری کی ''نئی دنیا کو سلام'' کے بہت سے حصے بھی اس اعتبار سے توجہ کے لائق ہیں۔

کیا جاں نثار اختر کی وہ شاعری جو ''پچھلے پہر'' میں ہے ترقی پسندی سے انحراف ہے؟

یہاں پھر وہی سوال اٹھتا ہے کہ ترقی پسندی سے ہماری مراد کیا ہے۔ ترقی پسندی اگر زندگی کی تبدیل ہوتی ہوئی حقیقتوں کے ادراک اور فن میں اس کے اظہار سے عبارت ہے تو جاں نثار اختر کی اس دور کی فکرمندی اپنے نقطۂ نظر سے منہ پھیرنے کی علامت نہیں بلکہ بدلے ہوئے حالات میں ایک نئی جستجو کی نشان دہی کرتی ہے۔

جاں نثار اختر نے اس دور میں عقیدے، یقین، اور حقیقت اور خواب غرض کہ ان سب باتوں پر شک کا اظہار کیا جو پہلے انھیں عزیز تھے۔

ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے — لگتا ہے جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں
اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں — جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں
تمہارے دل میں جو اب بھی ہو کوئی بات تو ہو — ہمارے دل سے تو سب کچھ نکل گیا ہے میاں

یہ محض اُن کا ذاتی مسئلہ نہیں بلکہ ہر طرف ایک ایسی نئی صورتِ حال نظر آتی ہے جب وہ سب ہی لوگ اپنا اپنا کوئی آسرا رکھتے تھے۔ اور اب ان آسروں کو بھی ٹوٹتا ہوا دیکھتے ہیں:

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے — کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے
بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود — ہر ایک فرد کوئی سانحا لگے ہے مجھے

مگر جاں نثار اختر کا یہ درد بھی تمام تر یاس و محرومی کا نہیں۔ ان کے اندر کوئی قوت ہے جو بار بار انہیں کہیں اور بھی لے جاتی ہے۔

ہم سے مایوس نہ ہو اے شب دوراں کہ ابھی
دل میں کچھ درد چمکتے ہیں اجالوں کی طرح

اے عہد ہم سے چاک قباؤں کا دن منا
سو آفتاب جن کے گریباں سے آئے ہیں

زندگی یہ تو نہیں تجھ کو سنوارا ہی نہ ہو
کچھ نہ کچھ ہم نے ترا قرض اتارا ہی نہ ہو

عقاید اور آدرشوں سے بدگمانی، یقین کا ٹوٹنا، جن سوالات کو حل کرنے چلے تھے ان کا حل نہ ہونا بلکہ اور پیچیدہ ہو جانا اور نئے سوالات کا سامنے آنا یہ سب کچھ ترقی پسندی کو غلط ثابت نہیں کرتا۔ بلکہ جد و جہد میں سرگرم لوگ ایسے حالات کا بھی سامنا کرتے ہیں۔ اور یہ کوئی نیا پہلو نہیں بلکہ زندگی میں ایک سخت تجربہ کی منزل ہے۔ ترقی پسند تحریک کی آزادی اور اشتراکیت کی جد و جہد کے جوش و خروش کے ساتھ ابھری۔ اس میں نہ صرف پورے طور پر شامل ہوئی بلکہ اس نے ادب اور آرٹ کے ذریعے نئے دور کی اعلا سیاسی اور تہذیبی اقدار کو ان لوگوں تک پہنچایا جن کی رسائی ان دقیق کتابوں تک نہیں تھی جن میں انسانی حقوق، معاشی مساوات جمہوری اور اشتراکی اصولوں سے متعلق فلسفے درج تھے۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ادب نے ملک کے پڑھے لکھے طبقے میں اور اسٹیج کے ذریعے ملک کے عوام میں ایک نیا شعور پیدا کیا۔ آزادی اور انقلاب کا تصور رومانی سہی مگر وہ ایک عظیم جد و جہد کا محرک تھا۔ آزادی کے بعد سب کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ تقسیم ملک کے نتائج جو ہوئے سو ہوئے اس کے بعد نیا نظام قائم ہوا، مگر اس میں جمہوری اقدار کو قائم کرنا کتنا سخت مرحلہ تھا اور ہے وہ آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔ خارجی سطح پر جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ یہ خوابوں کا ٹوٹنا جد و جہد کا ہی ایک مرحلہ ہے۔ جن لوگوں کے خواب ٹوٹے انھوں نے رومانی انقلاب پرستی کے دور میں جھوٹے خواب دیکھے ہوں گے مگر آج کے حالات میں خواب دیکھنے والے بھی کتنے ہیں۔ زندگی کا ترقی پسند نظریہ اور ادب کے ذریعے اسے پھیلانا اس کا ایک مفید اور مثبت پہلو تھا۔ چنانچہ وہ ادب جو فرقہ پرستی، فرسودہ خیالی ہر قسم کے استحصال کے خلاف ترقی پسند مصنفوں نے تخلیق کیا اس میں ایک بڑا حصہ ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے اور ان کے اضمحلال و اضطراب اور خود اپنے آدرشوں سے متعلق فکر مندی نے بھی ادب کی اور اصناف کے ساتھ غزل کو ایک نیا لہجہ اور نئی جہت دی۔

مگر یہ پورا دور بھی ترقی پسند تحریک کے لئے اس وجہ سے اپنے اندر زوال کے اسباب لئے ہوئے آیا کہ انھوں نے اپنا سفر جس آن بان سے شروع کیا تھا وہ خود اپنے بنائے ہوئے آئیڈیولوجی کے بحران کا شکار ہو گیا۔ اردو کے ترقی پسند مصنفین جب بھیمڑی کانفرنس کے زمانے کی سخت گیری سے نکلے تو انہیں پھر کہیں کوئی راستہ نہیں نظر آیا۔

پریشاں ہوگئے ہم صورتِ گردِ سفر آخر
کہاں تک ساتھ دیوانوں کا دیتی رہ گزر آخر

دراصل مسئلہ ترقی پسندوں کا مارکسی نظریے سے وابستگی کی بنا پر نہیں تھا بلکہ خود مارکسی منطق کے مطابق بدلتے ہوئے حالات میں زمانے کے ساتھ اپنے رشتوں کو بدلنے اور ادب کے رشتوں کے بارے میں ان نئی بحثوں میں شامل ہونے کا تھا جو ملک اور ملک کے باہر نہ صرف چل رہی تھیں بلکہ ہر جگہ کے ترقی پسندوں اور مارکسی نظریے کے ماننے والوں کی دلچسپی کا بھی مرکز تھیں۔سوشلسٹ بلاک کے ختم ہونے کے بعد بھی ساری دنیا میں بائیں بازو کی تحریکیں بڑھتی رہیں۔ان کی دانشورانہ سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا ہے۔ان حالات میں اردو میں ترقی پسند تحریک کا جو فروغ ہونا چاہئے تھا نہیں ہوا۔اس سارے عرصے میں اردو کے ترقی پسند اپنے پرانے زاویۂ نظر پر اصرار کرنے پر ہی سارے وسائل صرف کرتے رہے۔اس میں کوئی تازگی نہ رہی۔ کبھی کبھی کوئی لہر آگئی تو کانفرنس بھی ہوگئی۔مگر وہ ترقی پسندی کو کہیں بھی نہ لے گئی۔

۳۶ء کی باتیں اب سب مان چکے تھے۔وہیں اٹک کر رہ جانے کا مطلب ہی زوال تھا۔ آج اردو ادب میں ترقی پسند تحریک نام ہے اپنے شاندار ماضی پر فخر کا۔

آگہی اور تقاضے آگہی

ہماری ادبی بحثوں میں ''وابستگی'' اور ''نظریاتی وابستگی'' کا ذکر اکثر آتا رہتا ہے۔ شاید وقت کے تقاضوں نے ہمیشہ ان معینہ تصورات کو جو ان لفظوں کے پیچھے تھے، کچھ ڈھیلا اور وسیع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ''عصری آگہی'' کی اصطلاح وجود میں آئی، جب یہ بھی سخت گیر نکلی تو اسی کے متوازی ''عصری حسیت'' کا ظہور ہوا جو آگہی کی ضرورتوں سے آزاد زیادہ نرم اور لچکیلی تھی۔ چنانچہ تخلیق کاروں میں سے کچھ کی انا اور زیادہ تر کے عجز کو جگہ دینے کے لیے اس کا چلن ہو گیا۔ نقادوں اور تخلیق کاروں کی کشاکش اور مفاہمت کا خاموش عمل اس طرح کے کرشمے دکھاتا ہی رہتا ہے۔ طرح طرح کی اصطلاحیں، فارمولے، کلیشے وغیرہ آتے ہیں۔ بنتے بگڑتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ خیر! فی الحال تو ہمارا واسطہ ''آگہی'' خصوصاً ''عصری آگہی'' سے ہے کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں اعلا یا ادنا سطح پر پائی ضرور جاتی ہے۔ ادب میں بھی اور اس کے باہر بھی۔

''عصری آگہی'' کو معرض بحث میں لانے سے پہلے، یہ واضح کر دینا لازم ہے کہ اس سے ہماری مراد کیا ہے ہر زمانے میں آگہی کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جس پر کسی فرد کا اختیار نہیں ہوتا جو اُسے اپنے دور کے دوسرے افراد کی طرح سماجی ورثے کے طور پر ملتی ہے۔ مثلاً آج کا ہر انسان دنیا اور کائنات کے حقائق کے بارے میں انیسویں صدی کے لوگوں سے زیادہ شعور رکھتا ہے۔ اس کے ذہن میں بہت سے تصورات واضح ہو گئے ہیں، بہت سے توہمات ٹوٹ چکے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بہت سے نئے تصورات بھی آ چکے ہیں جن میں سے کچھ مبہم ہیں، نئے توہمات بھی بن رہے ہیں۔ اس ''آگہی'' کی ایک عام سطح ہوتی ہے جہاں تک اس زمانے کا ہر نارمل انسان خود بخود آ جاتا ہے۔ تعلیم، ذرائع ترسیل، رسل و رسائل اور روزمرہ کے انفرادی اور اجتماعی تجربات و مشاہدات غرضیکہ متعدد عناصر کبھی الگ الگ اور کبھی باہم مل کر اس عمل میں حصہ لیتے ہیں۔ دوسری

سطح وہ ہے جہاں ہر فرد اکتسابی عمل کے ذریعہ پہنچتا ہے۔ یہ سطح دراصل اس پہلی سطح کی بنیاد پر ہی ابھرتی ہے۔ افراد کا یہ عمل اجتماعی یا سماجی آگہی کو بلند تر کرتا ہے۔ آگہی کے حصول اور اس کے فروغ کی کوشش ایک مسلسل جدوجہد ہے جو ہمیشہ اور ہر سماج میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر جاری رہتی ہے۔ اس جدوجہد کی تیزی رفتار اور سستی رفتار اور کامیابی و ناکامی سے اس کے بلند و پست کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

ایک ہی زمانے اور ایک ہی سماج میں عصری آگہی کے مختلف اور متضاد تصورات ہو سکے ہیں اور ان کی باہمی کشمکش کے نتیجے میں حاصل ہونے والے تجربات انسان کو ترقی کی راہ پر لے جاتے ہیں۔ عصری آگہی کا تصور کچھ بھی کیوں نہ ہو شاعر اور ادیب ہر زمانے میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ آگاہ اور ان کے خیالات و احساسات سماج کی متاع گراں بہاں سمجھے جاتے رہے ہیں جنھوں نے پڑھنے اور سننے والوں کے خیالات و احساسات کی تہذیب کی ہے اور اس طرح اجتماعی آگہی کی سطح کو بلند تر کیا ہے۔

اسی سلسلے میں فن اور ادب کے مباحث کے دوران وابستگی Commitment کا بھی ذکر آتا ہے۔ وابستگی کی بات کرتے وقت ہمارے ذہن میں آج کے سماجی شعور کی عام سطح بھی ہوتی ہے جو غالب و میر کے دور کے سماجی شعور سے بہت مختلف ہے۔ آج ہماری زندگی میں اخبار، ریڈیو، سنیما، ٹیلی وژن، اشتہارات، الیکشن، جلسے جلوس، ٹریڈ یونین، سیاسی جماعتیں، ہڑتالیں اور نہ جانے کتنے ایسے عناصر شامل ہیں جو پہلے نہیں تھے جو ہمارے شعور کو بھی جھنجھوڑتے ہیں، غیر شعوری طور پر بھی ہماری زندگی میں ہماری شخصیت اور کردار میں سرایت کرتے رہتے ہیں اور ہمارے قول و عمل میں نمودار ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم میں سے ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ آخر ان سب چیزوں سے ہمارا تعلق کتنا اور کس قسم کا ہے، ہمیں جو معلومات بہم پہنچتی ہے وہ ہمارے تجربات و مشاہدات سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہے۔ ہم اپنے فہم و ادراک کے مطابق ان سوالات کے جواب دیتے ہیں اور اپنے لیے کوئی لائحہ عمل متعین کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آج کی زندگی ہر انسان کو کسی نہ کسی قسم کی وابستگی کی طرف مائل کرتی ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ وابستگی ہمیشہ صحت مند ہو یا ہر شخص کے ہاں مکمل اور واضح شکل میں ظاہر ہو مگر کسی نہ کسی شکل میں اس کا ہونا لازمی ہے۔ اس کا بہت بڑا ثبوت وہ تصورات ہیں جنھیں بعض اوقات اتنی تقدیس حاصل ہو جاتی

ہے کہ ہر شخص ان ہی کے پیرایے میں سوچنے لگتا ہے۔ ہر آدمی خواہ ان پر واقعی اعتقاد رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو ان ہی کی مالا جپنے لگتا ہے۔ وہ لوگ بھی جو ان تصورات سے قطعاً ناواقف ہیں، دنیا کے چلن کو دیکھ کر ان کو مان لیتے ہیں اور خود کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ مطلق صداقتیں ہیں جنھیں حاصل کر سکیں یا نہ کر سکیں، میں عزت حاصل کرنے کے لیے اپنی ہر بات کو ان کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش ضروری کرنی چاہیے۔ اردو شعر و ادب میں ایک زمانے میں تصوف کچھ اس قسم کی چیز تھی۔ ہر شخص (اپنی اصل زندگی میں وہ کچھ بھی ہو) اپنے کلام میں اسے ایک مانی ہوئی سچائی کے طور پر ضرور باندھتا تھا۔ تصوف ایک مقدس غلاف بن گیا تھا جس میں دنیا کی ہر شے کو چھپا کر سماجی زندگی میں عزت حاصل کی جا سکتی تھی۔ آج سوشلزم کو بھی کچھ اس طرح کا تصور بنا دیا گیا ہے۔ سوشلسٹ ملکوں کی حالیہ تبدیلیوں کے بعد اب اس کے خلاف ہوا چلی ہے ورنہ اب تک وہ لوگ بھی جو سوشلزم کو نیست و نابود کرنا چاہتے تھے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے سوشلزم کا ہی نام لیتے تھے۔ غرضکہ کسی نہ کسی قسم کی وابستگی سے مفر آج کسی کو نہیں۔ اور یہ وابستگیاں زندگی کی کشمکش کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جائیں گی۔ آج اس طرح کے دلائل بے معنی ہیں کہ جب غالب و میر وابستگی کے بغیر اعلا شاعر اور دانشور بن سکتے تھے تو ہم کیوں نہیں بن سکتے؟ اُن کے دور میں شعور و آگہی کی جو سطح درکار تھی اس کے مطابق ان کی بھی وابستگیاں تھیں جن کی نوعیت ہماری وابستگیوں سے مختلف تھی۔ بیسویں صدی میں اردو کے سب سے بڑے شاعر اقبال ہوئے۔ غالب اور اقبال دونوں عظیم شاعر ہیں مگر ان کی عظمتوں میں اس دور کو بھی دخل ہے جس نے انھیں آگہی عطا کی۔ ان ہی کے دور میں دوسرے لوگ غالب و اقبال اس لیے نہ بن سکے کہ وہ اپنے زمانے سے اتنا کچھ حاصل نہ کر سکے جو غالب و اقبال نے حاصل کیا جو کچھ انھوں نے حاصل کیا اُسے اپنے فن میں سمو کر اپنے زمانے کو دینے سے قاصر رہے۔ فرد اور سماج باہم کشاکش اور مفاہمت کے عمل سے گزرتے ہوئے تحلیل ہوتے رہتے ہیں ایک دوسرے کی تکمیل و توسیع کرتے ہیں۔ یہ عمل خط مستقیم پر نہیں ہوتا، اس کے نتیجے میں سماج کا ڈھانچہ بنتا بگڑتا رہتا ہے اور فرد کی ذات بھی بکھرتی اور نکھرتی چلی جاتی ہے۔ سماج کے جور و ستم کے خلاف احتجاج کی آوازیں اسی عمل کے دوران اٹھتی ہیں اور سماج کی آیندہ تشکیل میں حصہ لیتی ہیں۔ چنانچہ فرد کی آزادی آج کے سماج کا ایک اہم مسئلہ ہے اور فن کار کی آزادی کا سرچشمہ ہی دراصل اس کی آگہی ہے۔ آگہی سے بے بہرہ فن کار

آزاد ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ وہ اُن قوتوں کو پہنچان نہیں سکتا جو اس کی آزادی کی گھات میں ہیں۔ کہیں یہ قوتیں حاکموں کے فرمانوں اور سرکاری نظریوں کی شکل میں آتی ہیں کہیں ایسے فلسفوں کی صورت میں کہ فن کار دنیا میں سب سے الگ تھلگ اور سب سے بلند ہیں یا جب دنیا کی ہر قوت ان کی گھات میں ہو تو انھیں منہ چھپا کر بیٹھ رہنا چاہیے۔

فن کار محض فنکار ہی نہیں ہوتا، آج کے سماج میں اس کی اور بھی حیثیتیں ہیں وہ اپنے معاش اور روزگار کے لیے دوسروں کا دست نگر ہے جو اس کی قیمت اپنی ضرورت کے مطابق طے کرتے ہیں۔ وہ سرکاری دفتر میں کلرک، کسی اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں مدرس، کسی کارخانے میں ملازم ہوتا ہے۔ وہ بعض بظاہر آزادانہ پیشے بھی اختیار کر سکتا ہے مثلاً وکیل، سیاسی کارکن وغیرہ مگر ہر جگہ پیشے کی ضرورت کے مطابق حدود متعین ہیں۔ آج کے ادیب و شاعر کسی بھی شبہ کے مصاحب بن کر کتنے ہی اترتے پھریں۔ ان کی آبرو شہر میں سب پر عیاں ہے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی آج جنسِ بازار ہیں موجودہ نظام کو ان کی ضرورت محض اس لیے نہیں کہ وہ شاعر اور ادیب ہیں بلکہ اس لیے بھی ہے کہ وہ کسی اور اعتبار سے سماج کے حاکموں کے مفاد کے لیے ضروری ہیں ان کے فن کی اہمیت اور اس اعتبار سے ان کی حیثیت آج نظام میں ثانوی ہے اور یہ حیثیت بھی غالب کے الفاظ میں بس ''مزدوری عشرت گہ خسرو'' سے زیادہ نہیں۔ ان حالات میں آج کے ادیب کا یہ سوال کہ اس کے وجود کی حقیقت کیا ہے۔ اس نظام سے اس کا تعلق حریفانہ کیوں ہے؟ وہ کیوں اور کس کے لیے جیتا ہے؟ اس کی اپنی تمنائیں اور آرزوئیں کیوں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں؟ وہ اس بے در نظام کا بے اختیار حصہ بن کر کیوں رہ گیا ہے اس کے لیے اس سے بھاگ نکلنے کی کوئی صورت ہے یا کیا وہ اس صورت حال کو بدل سکتا ہے۔ یہ آج کی زندگی کے حقیقی اور قابل غور سوالات ہیں اور ہمارے آج کے شعر و ادب میں طنز و آئرنی (irony) وغیرہ کی بڑھتی ہوئی لے اور اس کی مقبولیت و اثر انگیزی اسی آگہی کی فریاد ہے۔

آج ہمارے ملک میں زر پرستی بُری چیز نہیں سمجھی جاتی بلکہ یہ سماجی عزت کی علامت بن گئی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام لالچ پر قائم ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے تحفظ بھی کرتا ہے۔ چنانچہ ہر آدمی کے دل و دماغ میں لالچ بڑھانے کا پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہمارا ملک اگر لسانی، نسلی، طبقاتی اور علاقائی اعتبار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے تو کیا ہوا زر پرستی کی قدر مشترک تو موجود ہے جو شمال و

جنوب اور اعلا و ادنا کو ایک سیاسی و معاشی شیرازے میں باندھے ہوئے ہے، ادیب و شاعر اسی معاشرے کے افراد ہیں۔ یہاں زندہ رہنے کے لیے انھیں وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جو آج ضروری ہے۔ ہم اس نظام سے اُکتا بھی گئے ہیں مگر اس سے ہماری وفاداریاں پورے طور پر ختم بھی نہیں ہوئی ہیں۔ فریبوں میں مبتلا رہنے کی صلاحیت ہم میں بہت ہے۔ ہر فریب پر ہمارا ایمان اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کسی نئے فریب میں گرفتار ہونے کا وقت نہ آجائے، غریبی ہٹاؤ کے نعرے سے لے کر مندر مسجد اور منڈل تک ایک طلسم جو بندھا رہتا ہے۔

آج جب کہ سماج میں بے اطمینانی اور آسودگی پھیلتی جا رہی ہے ہمارے ادیب و شاعر خود کو اس سے کیسے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ یہ نا آسودگی سماج کو بدلنے کا کارگر حربہ ابھی تک نہیں بن سکی۔ ایک زمانہ تھا جب ترقی پسند شعرا روس اور چین کی طرف دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ:

اب اُجالے مری دیوار تک آپہنچے ہیں

یہ اُجالے بس دیوار تک آ کر رہ گئے اور ہم سوچتے رہ گئے کہ ''رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی۔'' بہت سے ترقی پسند شعرا میر و سودا کے انداز میں غزلیں کہنے لگے۔ کلاسیکی لہجے اور استعارے میں مارکسزم بھی ''پھولوں کی چھڑی'' بن گیا جس پر تصوف کے اشعار کی طرح جھوما جا سکتا تھا مگر فائدہ بھی ہوا غزل اور دلربا ہوگئی۔ بعض نے ترقی پسندی اور مارکسزم کو اپنی بربادی کا ذمے دار ٹھہرایا، اس کے ردعمل کے طور پر ایک رجحان پیدا ہوا کہ ہر اس بات کی تردید کی جائے جس سے ترقی پسندی عبارت تھی۔ یہ صورت حال ان لوگوں کے لیے فائدہ مند تھی جو اشترا کی نظریات کی مقبولیت سے سہمے ہوئے تھے۔ انھیں بڑا سہارا ملا۔ سماج کے مقابلے میں ذات خواہ وہ بلا صفات ہی کیوں نہ ہو اتنی اہم قرار دی گئی کہ جو ''بے چہرہ'' اور ''بے سمت'' تھے وہ بھی چمکنے لگے اور اچھے خاصے چہرے والے بھی اپنی ''ڈھونڈنے میں لگ گئے مگر اس قسم کے محرکات سنجیدہ ادب کی بنیاد تو نہیں بن سکتے تھے۔ پھر یہ جادو بھی اپنے آپ ٹوٹ گیا۔

اب بہت سے پرانے نشے اتر چکے ہیں۔ موجودہ حالات سے بیزاری اور بے اطمینانی نے فن کار کو نئی سمتوں کی تلاش کا حوصلہ عطا کیا ہے۔ وہ اپنے نظریات کی تعبیر کے لیے دوسروں کا محتاج نہیں رہنا چاہتا۔ نئی سمتوں کی تلاش میں وہ فکر و فن کی نئی راہوں میں سفر کرتا ہے اور نئے حقائق سے آشنا ہوتا ہے۔ آج کے ادیب و شاعر کے ہاں روایتی زبان اور جانے بوجھے پیرایوں کی ٹوٹ

پھوٹ شعریات کے مسلمہ اصولوں سے بیگانگی اظہار کے نئے پیمانوں اور پیکروں کی تلاش اور ان میں بعض اوقات ناکامی ہماری موجودہ سماجی زندگی کی دین ہے۔ اظہار خیال کے وسائل و ذرائع پر ارباب اختیار کی گرفت سخت تر ہوتی جارہی ہے اور نہ جانے کتنے ان دیکھے طریقوں سے اس کا گلا گھوٹنے کی کوشش کی جارہی ہے ان حالات میں اگر کوئی خاندانی منصوبہ بندی والے مشاعروں کی شاعری نہ کرنا چاہے تو اس کے سامنے راستہ کیا ہے سوائے اس کے کہ تسلم شدہ معیاروں سے گریز کیا جائے۔ نئے پیرایوں کی تلاش کی جائے، کبھی کبھی مسلمہ اقدار کا مذاق اڑا کر کبھی لفظ و معنی کے نظام کو درہم برہم کر کے اور کبھی متعینِ استعارات وتشبیہات کو توڑ کر جھوٹے اور مصنوعی محرکات سے فن وادب نہیں ابھرتا۔ آج کی زندگی میں ایک ذہین اور حساس انسان بھی بیزاری تنہائی اور اجنبیت محسوس کرتا ہے، اس کے یہ احساسات زندگی کے سچے اور گہرے تجربے کا نتیجہ ہیں۔ وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں کہ ہر چند فنکار کا تخلیقی عمل انفرادی ہوتا ہے لیکن عرفانِ ذات دراصل سماجی شعور کی ہی ایک جہت ہے۔ سماج اور فن کار کے رشتوں کی پیچیدگیوں کا حل نہ نفی ذات ہے اور نہ محض خلا میں اثبات ذات۔ ہم کیوں لکھتے ہیں، کس کے لیے لکھتے ہیں، جمالیاتی تجربہ، تخلیقی عمل، ہیئت و زبان کی پیچیدگیاں، ترسیل وابلاغ کے مسائل یہ سب اسی بڑے سیاق وسباق میں ہی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس سے الگ ان کی حیثیت محض فرضی ہے۔ آج ادب صرف لکھا اور پڑھا ہی نہیں جاتا سنا بھی جاتا ہے اور دیکھا بھی جاتا ہے۔ یہ ریڈیو، سنیما اور ٹیلی وژن کے ذریعے ان لوگوں تک بھی پہنچتا ہے جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے، فن کار کی آگہی دور دور تک پھیلتی ہے لوگوں کے دل و دماغ میں سرایت کرتی ہے اور بہت سے اس کے ہمنوا بھی ہو جاتے۔ چنانچہ آج کا فنکار اتنا تنہا نہیں جتنا کہ وہ خود کو سمجھتا ہے۔ ہاں اگر مصنوعی طور پر خود کو دنیا جہان سے نرالا ثابت کرنے کے لیے ایسے پیرایے اختیار کرتا ہے جو ہر سمجھ دار کی سمجھ سے دور ہوں تو وہ فنی اور جمالیاتی تجربے کی کھری تخلیق نہیں اس میں کسی احساس کمتری کا چھوٹا پن شامل ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو دراصل کہنا تو کچھ بھی نہیں ہوتا صرف یہ دکھانا مقصود ہوتا ہے کہ ہم بھی اپنا وجود رکھتے ہیں اور اس وجود کو منوانے کا کوئی اور ذریعہ ہمارے پاس نہیں سوائے اس کے کہ ایک ٹانگ پر کھڑے رہیں یا سر کے بل چل کر دکھائیں۔ سچا تخلیقی تجربہ اپنا جواز خود ہوتا ہے اس کا رنگ، اس کی آب و تاب خود بخود دوسرے رنگوں کو پھیکا اور چمک دمک کو ماند کر دیتا ہے اور اس کی کوتاہیوں اور لغزشوں پر بھی نثار ہوا جاسکتا ہے۔

غزل اس نے چھیڑی ....

غزل اردو شاعری میں ہی نہیں ہماری ثقافتی زندگی میں ایک نمایاں اور مستقل جگہ حاصل کرچکی ہے۔ اس نے موسیقی کی دنیا میں ایک الگ طرز کو جنم دیا۔ اردو کے فروغ کے ساتھ یہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پہنچی اور دوسری زبانوں نے اسے اپنایا۔ یہی نہیں مغرب کے بعض اہم شعراء نے غزل کی ہیئت کو تجرباتی طور پر برتنے کے بعد اس کے امکانات کو دریافت کیا۔ چنانچہ یہ بحث اب فرسودہ ہوچکی ہے کہ غزل کو بحیثیت ایک صنف کے زندہ رہنا چاہئے یا نہیں۔ کوئی چاہے یا نہ چاہے غزل نے اپنے وجود کو منوالیا ہے۔ غزل کا رس ہماری فضاؤں میں رچا بسا ہے۔ اس کے تجربوں سے ابھرنے والا نغمہ ردیفوں اور قافیوں کا ترنم، مختلف اشعار میں باہم ربط پیدا کرنے والی خاموش احساس کی زیریں لہریں سب مل کر ایک ایسی طلسماتی کیفیت پیدا کردیتی ہیں کہ کوئی اس کے اثر سے بچ کر نکل نہیں سکتا۔ غزل کی سطح پر اُبھرنے والا پرکشش تخیلی اور سماعی منظر سننے والوں کو اپنی گرفت میں لے کر معانی کی ان گہری تہوں میں لے جاتا ہے جہاں علامتوں، استعاروں اور تمثالوں کی تخلیق کی ہوئی ایک دینا ہوتی ہے۔ غزل کے یہی حرکی عناصر ہیں جو اُسے کبھی فرسودہ نہیں ہونے دیتے۔ اس کے داخلی نظام میں نشوونما پانے، بڑھنے اور پھیلنے کی اتنی صلاحیت ہے کہ وہ ہر دور میں اعلیٰ ترین شعری تخلیقات کی محرک رہی ہے۔ میرؔ کا اپنے دیوان کے بارے میں یہ کہنا کہ ''جہاں سے دیکھئے اک شعرِ شور انگیز نکلے ہے'' یا غالب کا اپنے اشعار کے ہر لفظ کو ''گنجیۂ معنی کا طلسم'' قرار دینا۔ فراقؔ کا یہ کہنا کہ ''خود اپنے خیالوں کو ہم دم میں ہاتھ لگاتے ڈرتا ہوں''، محض شاعرانہ تعلّی نہیں۔ یہ ان پوشیدہ وسعتوں اور پہنائیوں کی طرف اشارہ ہے جو غزل کی سرشت میں شامل ہے۔

غزل ابتدا میں دکن، دہلی اور لکھنؤ میں پھلی پھولی اور پھر سارے بر اعظم میں ہند ایرانی تمدن کے زیر اثر اردو کے فروغ کے ساتھ پھیلتی چلی گئی۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی اہم شہر ہو جہاں اردو غزل گوئی کی روایت نہ پہنچی۔ مختلف صوبوں اور ریاستوں کے صدر مقام اردو شعر و ادب کے مرکز بھی تھے اور اساتذہ کے فیض سے غزل کا نغمہ بھی وہاں کی آب و ہوا میں سرایت کر گیا۔ عظیم آباد، حیدر آباد، کلکتہ، بھوپال، رام پور، لاہور اور پھر بمبئی جیسے بڑے شہروں کی مجلسی اور ثقافتی زندگی کا کوئی تصور غزل کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

غزل کو اپنی اس مقبولیت کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ جب کوئی فن روایت بن جائے تو اس کے چوکھٹے کے اندر جس چیز کا میل بیٹھ جائے اسے اس کے اندر شامل کیا جانے لگتا ہے۔ اسکی شناخت اسی نام سے کی جاتی ہے اور کیوں نہ کی جائے جب ہر بات فارمولے پر پوری پوری اتر آتی ہے! غزل کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

شاعروں کی مقبولیت انداز غزل خوانی اور ترنم کے اچھے برے اثرات نے ملکر کچھ ایسا کر دیا ہے کہ معمولی صلاحیت رکھنے والا بھی چند قاعدوں کی پیروی کر کے آسانی کے ساتھ غزل کہہ سکتا ہے۔ مگر یہ غزل کا اصلی روپ نہیں۔ اس کا بہروپ ہے۔ اور یہ بہروپ کبھی کبھی اتنا نمایاں ہو کر آیا کہ اس کی بنا پر غزل کے بارے میں رائے قائم کر لی گئی۔ غزل کو اپنی مقبولیت کی قیمت آئندہ بھی ادا کرنی پڑے گی مگر اس کے باوجود ہر عہد کی نمائندہ غزل وہی ہے جس کی بنا پر رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا تھا۔

غزل کا ہر شعر دراصل دو مصرعوں پر مشتمل ایک مکمل نظم ہے۔ کوئی شعر اپنی تکمیل کے لئے کسی دوسرے شعر کا مرہون منت نہیں ہوتا۔ بس بحر، قافیے اور ردیف کا التزام ان چھوٹی چھوٹی اکائیوں کو ایک نظام میں مربوط کرتا ہے۔ غزل کی یہ بنیادی صفت ہی زیادہ تر اعتراضات کا سبب رہی ہے۔ غزل کے نقادوں کا کہنا ہے کہ ہیئت کی یہ پابندی شاعر کے تخلیقی فکر و تخیل کو محدود کر دیتی ہے۔ اُسے قافیہ، ردیف اور وزن کے متعین پیمانے کے مطابق سوچنے اور شاعری کرنے پر مجبور بھی کرتی ہے۔ اور یہ صنف ان ہی لوگوں کو راس آتی ہے جن کے جذبہ و ذہن میں انتشار ہوتا ہے۔ غزل میں خیال کا ارتقا اور اظہار میں تسلسل نہیں ہو سکتا۔ اس کا پیرایۂ اضطراری ہے تعمیری نہیں۔

غزل کا اچھا سے اچھا شعر بھی بجلی کی طرح کوند کر رہ جاتا ہے۔ یہ دھیمے دھیمے سلگنے والی آگ کی طرح دیر تک نہیں جلتا۔ میری رائے میں غزل پر خود یہ اعتراض شاعر کی تخلیقی صلاحیت کو اسیر کرنے کی خواہش کا غماز ہے۔ اردو میں دوسری ایسی اصناف موجود ہیں جن کی ہیئت میں ارتقائے خیال، تسلسل اور تعمیری پیرائیہ اظہار کے سارے امکانات ہیں۔ کلاسیکی مثنویوں، مرثیوں، قصیدوں سے لے کر فیض، اختر الایمان اور ان کے بعد کی نسل کے شعرا کی تخلیقات تک اس کی بہترین مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ غزل کچھ ایسے تقاضے کرتی ہے جو نظم نہیں کرتی۔ چند لفظوں میں پوری بات کہہ دینا اور اسطرح کہنا کہ سننے والوں کے ذہن میں شعر محفوظ ہو جائے اور مختلف حالات میں بار بار بالکل انوکھے طور پر ظہور کرے کوئی معمولی بات نہیں۔ غزل نے ایک انداز گفتگو کی تہذیب و تشکیل کی ہے۔ سنجیدہ اور شائستہ محفلوں میں غزل کا شعر برجستہ آتا ہے۔ اور یہ شعر بسا اوقات محض آرائش بیان ہی نہیں کرتا بلکہ خود فکر و خیال کے عمل کے دوران ابھرتا ہے۔ اس طرح کسی معروف یا غیر معروف شعر کا ورود ہوتا ہے تو لگتا ہے جیسے اس شعر نے ایک نیا جنم لیا ہو۔

چنانچہ شاعروں کے بہترین اشعار شاعروں کے مجموعہ کلام میں دفن نہیں ہماری روز مرہ کی زندگی کا حصہ ہیں۔ اور اسی کے ساتھ نشو و نما پاتے ہیں، زندہ رہتے ہیں۔ غزل کے اچھے اشعار کسی خاص عہد کسی خاص مقام اور کسی خاص شخص کی زندگی سے ابھرے ہیں مگر وہ اپنی جمالیاتی صفات کی بدولت ان حدوں سے نکل کر دوام حاصل کر چکے ہیں۔

غزل کے فروغ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ ہر عہد کے انسان کے جذباتی نشیب و فراز میں اس کی رفیق رہی ہے۔ وصال و ہجر کی کیفیتیں ہوں کہ قطرہ و دریا، ذرّہ و صحرا، فرد و کائنات کے رشتہ کی نوعیت، سلطنتوں کا درہم برہم ہونا اور شہنشاہوں کا دربدر ہونا ہو کہ مستوں کی ہاو ہو بغاوت و احتجاج بن کر ہر نئے آنے والے رجحان کے لئے غزل نے اپنا دامن پھیلا دیا ہے۔ غزل میں علامتوں اور استعاروں کا نظام اپنے اندر اتنی حرکت اور لچک رکھتا ہے کہ ہر بڑے فن کار نے اس کے اندر اپنے فکر و عمل کے لئے امکانات کا ایک بے کراں میدان پا لیا ہے۔ اختصار کے ساتھ ابہام گرچہ لازم نہیں مگر اس کا امکان یقیناً زیادہ ہوتا ہے۔ یہ ابہام سننے والوں کے تخیل کو معانی کی نئی جہتوں میں سفر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ غزل کی مقبولیت میں اس ابہام کی پیدا کی ہوئی

گنجائشوں کو بھی بڑا دخل ہے۔ ابہام بالکل نہ ہو تب بھی غزل کا شعر کسی بھی ایسی صورت حال پر منطبق کیا جا سکتا ہے جو اس شعر کے خالق کے وہم و گمان سے بھی دور ہو۔ ابہام کے اندر معانی تلاش کر لینے کی گنجائش اور بالکل کھلے ہوئے معانی کو نیا رخ دے کر پیچیدہ بنا دینے کی گنجائش شاعر اور اس کے سننے والے کے قریبی رشتے کا پتہ دیتی ہے۔ اور یہ رشتہ بالخصوص غزل ہی کی دین ہے۔ تخصیص کی جگہ عمومیت، وضاحت کی جگہ ابہام میں نہ اتنی اچھائی ہے نہ برائی۔ اس کا انحصار تو اس پر ہے کہ شاعر کا رویہ کیا ہے اور وہ ان سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ اردو غزل کے بارے میں یہ خیال تو کبھی بھی صحیح نہ تھا کہ وہ صرف معاملات عشق تک محدود ہے۔ اگر ہوتی بھی تو یہ کوئی عیب نہ تھا غزل میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے اور یہ بہت کچھ وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا ہی رہا ہے میر نے کہا تھا:

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

اور اب تو یہ بھی صحیح نہیں کہ غزل کا لہجہ نرم و نازک ہونا چاہئے اقبال کے بعد کی غزل کا امتیازی وصف ہی اس کا نیا لہجہ ہے اس لہجے میں قوت و توانائی ہے۔

نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے
شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں

اقبال نے عشق کو ایک نیا فلسفیانہ تصور دیا۔ شوق و آرزو اور نالہ و فغاں کو تازہ تر مفاہیم عطا کئے۔ پھر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر غزل ایک واضح سیاسی اور سماجی شعور سے آشنا ہوئی۔ ترقی پسند شاعروں نے کلاسیکی علامتوں کو نئے معانی دینے، لہجے میں نیا پن اور باغیانہ خروش آیا جو اُردو شاعری میں پہلے کبھی نہ تھا۔ آج کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت اس طنز میں ڈوبے ہوئے تیکھے لہجے کا فروغ ہے۔ کلاسکی شاعری میں اس قسم کا لہجہ صرف ناصح محتسب اور رقیب کے لئے مخصوص تھا۔ ہر چند اردو شاعری کے یہ روایتی Villain آج نہیں پائے جاتے مگر اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالئے تو ان کی صفات نئے نئے روپ میں ہر سمت نظر آئیں گی۔ آج کا انسان جن قوتوں سے نبرد آزما ہے ان کا روپ آج کی غزل کے اسی تیکھے، تلخ، طنز آمیز لہجے میں دکھائی دیتا ہے۔ آج

کا شاعر روایتی علامتوں اور استعاروں سے بھی آگے جا چکا ہے اب گل و بلبل، قیس، کوہکن، طور، موسیٰ کا ذکر کم سے کم ہے۔ اس کی جگہ آج کی زندگی سے ابھرنے والے استعارے نے لے لی ہے۔ آج کے لہجے میں لجاجت اور پسپائی کی جگہ جھنجلاہٹ اور احتجاج ہے آج کے شاعر میں جرأت فکر بھی ہے اور جرأت اظہار بھی۔ وہ ذات اور کائنات کے رشتوں کی پیچیدگیوں کے ادراک سے وجود میں آنے والی حسیت کا شاعر ہے۔ اسے اپنی حدوں کا اندازہ ہے مگر وہ ان حدوں سے گزر جانے کا آرزومند بھی ہے۔ اس کے جہد و کشاکش سے وجود میں آنے والی اداسیوں اور کامرانیوں نے آج کی غزل کے مزاج کو بنایا ہے۔

غزل اور نئے تقاضے

ہماری ادبی بحثوں میں غزل کی نارسائی کے شکوے اب ختم ہو چکے ہیں۔ گذشتہ صدی میں خصوصاً پچھلے پچاس برسوں میں ہماری تہذیب جس تلاطم سے گزری اور آج جن حالات سے سابقہ ہے ان کی زد میں آ کر صدیوں کے بنے بنائے کتنے ہی سانچے ٹوٹ چکے ہیں۔ آدرش، اقدار، رویے سب کسی نئی سمت کی تلاش میں ہیں۔ غزل میں اگر اپنی قوت نہ ہوتی تو وہ بھی قصیدے کی طرح ہماری ادبی تاریخ کا بس ایک حصہ بن کر رہ گئی ہوتی۔ خصوصاً جب کہ خود ہمارے نہایت اہم اور باثر نقاد اور شاعر اسکی جان کے درپے تھے۔ شاعری کے وسیع تر امکانات کی تلاش کی بدولت نظم کے نئے سے نئے طرز ڈھالنے کی کوششیں اپنے دائرے کے اندر تو یقیناً کامیاب ہوتی رہیں اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔ مگر اس سے غزل کا متبادل وجود میں نہیں آسکتا۔

کسی بھی جیتی جاگتی زبان کا تصور تخلیق کے نئے تجربات کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ تخلیق کا مفہوم کسی ایسی شے کو وجود میں لانا ہے جو پہلے موجود نہ ہو۔ مگر نئی فنی تخلیق کے پیچھے ایک دو لوگوں کا نہیں زبان کے پورے ادبی حلقے کا مدتوں کا ریاض ہوتا ہے۔ نئے تجربات بھی اسی ادبی ریاض کی بدولت ظہور میں آتے ہیں۔ تجربہ کرنے والے تخلیق کار اپنی روایت سے اپنے عہد کی فضا سے اپنے قریبی ہم عصروں سے حاصل تو بہت کچھ کرتے ہیں مگر ان ہی کے درمیان اپنی انفرادیت کو اجاگر بھی کرتے ہیں۔ نئے تجربات کے لئے یوں تو کوئی شرط نہیں ہوتی۔ مگر ہر صنف کی اپنی ایک منطق ضرور ہوتی ہے۔ جس کے مطابق تجربات کی جہت اور نوعیت خود بخود طے ہوتی چلی جاتی

ہے۔غزل کی ہیئت فارسی اور اردو کی صدیوں پرانی روایت نے متعین کی تھی جس کے بغیر غزل کی صنف کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔اس سے انحراف کی ایک صورت عہد حاضر میں آزاد غزل کی صورت میں نکالی گئی۔مگر یہاں بھی ردیف ،قافیہ،مطلع ،مقطع اسی طرح رہا،بحریں ارکان کی کمی بیشی کے باوجود وہی رہیں۔اس سے قطع نظر کہ یہ تجربہ کہاں تک کامیاب ہوا آزاد غزل ہی اس بات کا ثبوت بھی بن گئی کہ اس جیسا تجربہ بھی غزل کی روایت کی منطق کے باہر نہیں کیا جا سکتا۔اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہر صنف نہ صرف روایت کی سند اور قوت اپنے ساتھ رکھتی ہے بلکہ اپنے لئے خود ایک ایسی نفسیاتی فضا بھی بناتی ہے۔جو زمان و مکاں کی آزمائشوں سے گزر کر مضبوط تر ہوتی جاتی ہے۔تخلیق کار جب اس صنف میں کچھ تخلیق کرتا ہے تو بالکل ان دیکھے ان جانے طور پر قارئین کے ایک حلقہ کی توقعات کہیں نہ کہیں اس کے ہاں کارفرما ہوتی ہیں۔اور اسی بنا پر فن کار اور اس کے قاری کے درمیان رشتہ استوار ہوتا ہے مگر جب ہم غزل کا ذکر سنتے ہیں تو ہماری توقعات صرف غزل ہی کے معیاروں کے مطابق رہتی ہیں۔قصیدہ ،مرثیہ،مثنوی وغیرہ ذہن سے محو ہو جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب غزل کی ہیئت اس کی شعریات کی ساری شرائط ہمیشہ سے طئے ہیں تو اس میں اندرونی وسعتوں اور گہرائیوں کی صفت کہاں سے آتی ہے۔غزل کے اشعار کا ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہوئے بھی ہم رشتہ ہونا ایک کولاژ کے مماثل ہے، جہاں فن کار مختلف اور متضاد Images کو یکجا کر دیتا ہے اور الگ الگ اکائیوں سے ایک نئی اکائی وجود میں آجاتی ہے۔یہاں تخلیق کار مختلف اجزاء میں ایک ان دیکھے داخلی رشتہ کو دریافت کر کے صرف ایک تنظیم کے ذریعے ایسی اندرونی وحدت اجاگر کر دیتا ہے جہاں سب Images اپنے اپنے معانی رکھتے ہوئے بھی کسی ایک نئی معنویت کی تعمیر میں حصہ لیتے وقت اس بڑے خاکہ میں تحلیل ہوتے ہوئے ملتے ہیں۔

غزل کی مقبولیت اور اسکے فروغ کا سبب اس کی صنفی روایت کی متعین کی ہوئی حدود کے اندر اندر نئی جہتوں کو دریافت کرنے کے لئے تجربوں کی گنجائش ہے جو ہم غزل کی پوری تاریخ میں دیکھتے رہے ہیں۔اس کا علامتی اور استعاراتی نظام ہر زمانے کے شعور کی سطح کے مطابق

وسعتیں حاصل کرتا رہا ہے۔ تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا ورثہ بھی جو ہمارے ہاں فارسی سے آیا جامد نہیں رہا۔ وہ الفاظ جو ابتداً داخلی انسانی کیفیات اور زیادہ تر حسن وعشق کے معاملات اور عام دینوی رنج وراحت کے اظہار کے لئے استعمال ہوتے تھے، تصوف کے زیر اثر ایک سے زیادہ معنوی جہتوں کے ساتھ پہلے سے ہی موجود تھے۔ وہ انیسویں صدی کے آخر تک ایک نئے احساس کے اظہار کا ذریعہ بننے لگے تھے۔ جس وقت یہ کہا گیا۔

چیخ اٹھتے ہیں تماشہ اس چمن کا دیکھ کر
نالۂ بے اختیارِ بلبلِ نالاں ہیں ہم

تو ظاہر ہے کہ یہاں چمن اور نالۂ بے اختیار بلبلِ نالاں سے گل وبلبل کا روایتی عشق سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر جب اقبال نے کہا۔

اس چمن میں پیر و بلبل ہو یا تلمیذِ گل
یا سراپا نالہ بن جا یا نوا بیدار کر
نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

تو یہ ایک نئے زمانے کی بالکل نئی فکری اور جذباتی فضا تھی جس نے مروجہ استعاروں کی اندرونی معنوی جہات یکسر بدل دی۔ پھر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر معانی کے نظام میں اور وسعت آئی۔ مجاز، جذبی، مجروح، فیض اور دوسرے ترقی پسند شعرا نے اشتراکی نظریے کے جوش وخروش کو اور اپنے عہد کی سماجی ناانصافیوں کو اسی استعارے میں سمو دیا۔

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری ہے نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

روک سکتا ہمیں زندان بلا کیا مجروح
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

اس عہد میں جگر مرادآبادی تک کی غزل میں ایک نیا رنگ آیا جو خود ان کے ہاں پہلے بھی

نہیں تھا۔

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

آزادی کے بعد جہدِ آزادی کے زمانے کے سارے خواب پاش پاش ہو گئے۔ زمانے نے جب پھر کروٹ بدلی تو شاعری میں کلاسیکیت اور رومانیت کا افسوں ٹوٹ چکا تھا۔ اس عہد کے شاعر نے ماضی کو تمام تر رد نہ کرتے ہوئے بھی روایت سے انحراف کیا۔ ہمارے ہاں خلیل الرحمٰن اعظمی اور پاکستان میں ناصر کاظمی اور احمد مشتاق جیسے شعرا نے کلاسیکی رکھ رکھاؤ کو قائم رکھتے ہوئے نئی راہ اختیار کی۔

کوئی شرر نہیں بچا پچھلے برس کی آگ میں
ہم نفسانِ شعلہ خو آگ نئی جلائیے

اب پہلے سے معروف شعری زبان کی جگہ روزمرہ کی زبان سے نئے الفاظ اور عام زندگی کی اشیا سے نجی استعاروں اور علامتوں کو تراشنے کا چلن عام ہوا۔ خوابوں کا ٹوٹنا گھر سے بے گھر ہونا، پرہجوم شہروں کا اجڑا پن ہر طرف سے امڈتی ہوئی بھیڑ میں انسان کی اجنبیت اور تنہائی اور اسی طرح کی فنی حسی کیفیات کا اظہار دھوپ، سایہ، ہوا، جنگل، سمندر، ساحل، پیڑ، پرند، سائبان گھر جیسے الفاظ کے ذریعے کیا جانے لگا۔ اور ایک نئی شعری زبان ظہور میں آئی جو آج کی زندگی کی سچائیوں سے عبارت ہے۔ بعض الفاظ کی تکرار سے ایک یکسانیت کا احساس تو یقیناً ہونے لگا ہے مگر اس کے باوجود بہت سے شاعروں نے اپنی انفرادی شناخت پائی۔ ندا فاضلی شہریار، عرفان صدیقی بانی، زیب غوری، محمد علوی، مظہر امام مخمور سعیدی، شجاع خاور، اور متعدد ایسے نام ہیں جو آج کی غزل کی نمائندگی کرتے ہیں۔

شائستہ محفلوں کی ہواؤں میں زہر تھا
زندہ بچے ہیں ذہن کی آوارگی سے ہم

ندا فاضلی

تمام خلقِ خدا اس جگہ رکی ہے کیوں
یہاں سے آگے کوئی راستہ نہیں ہے کیا
شہریار

اب ہواؤں سے کیا گلہ کیجیے
خاک ہے دربدر تو ہوگی ہی
عرفان صدیقی

ایک جھونکا ہوا کا آیا زیب
اور پھر میں غبار بھی نہ رہا
زیب غوری

سبھی اپنے اپنے جنازوں میں گم
سبھی اپنے ہونے پہ مغموم تھے
محمد علوی

گرتی ہوئی دیوار کو سب دیکھ رہے تھے
اس شہر میں کچھ اور تماشہ بھی نہیں تھا
مظہر امام

ان شعروں میں ایک نیا لہجہ بھی نمایاں ہے۔ ہماری شاعری میں لہجے کی اہمیت تو ہمیشہ رہی ہے۔ یہ دراصل اردو کی امتیازی خصوصیت ہے جس کا تعلق شاعر اور سامع کے براہ راست رابطہ سے ہے جو ابتداء سے ہی ہماری روایت کا حصہ رہا۔ کلاسیکی شاعری میں بھی اس کی مثالیں وافر ملیں گی۔ غزل میں دو مصرعوں میں ساری بات کہہ دینے کا تقاضا بھی یہ ہے کہ لفظ ہی نہیں پسِ لفظ چھپی ہوئی نفسیاتی کیفیات کو بھی عیاں کیا جائے۔ ان کے ذریعے جذبے اور احساس کی ان پرتوں کو کھولا جائے جو محض لفظ کی ظاہری صورتوں میں نمودار نہیں ہوسکتیں۔ لہجے کے ذریعہ نازک سے

نازک خیالات سے لے کر سخت و کرخت باتوں تک سب ہی کچھ سمویا جا سکتا ہے۔ آج کی غزل نے اس سے کچھ اس طرح فائدہ اٹھایا کہ موجودہ صورت حال میں نجی احساسات اور زاویہ ہائے فکر نمایاں ہو سکیں۔

طنز کا پہلو بھی آج پہلے سے زیادہ ہے۔ زمانے کے چلن اور تیزی کے ساتھ بدلتی ہوئی ہوا کے آگے کھڑا نہ رہ سکنا ایسا تجربہ ہے جو کسی کو اداس کرتا ہے اور کسی کو خود اپنے آپ پر ہنسنے پر مائل کرتا ہے۔

ہم صوفیوں کا دونوں طرف سے زیاں ہوا
عرفانِ ذات بھی نہ ہوا رات بھی گئی
شجاع خاور

کس لئے باغ لگائے ہیں صف آراؤں نے
آگ سے بچ کے نکل جانے کا امکان ہے کیا

مگر جدید غزل نے اپنے تمام تر نئے پن کے باوجود اساتذہ کی روایت سے مکمل طور پر رشتہ منقطع نہیں کیا۔ ان کا تعلق اب تک جاری ہے۔ نئے نئے ردیف اور قوافی کے ذریعے اظہار کے لئے پہلو تلاش کرنا کسی ایک ردیف کے تمام ممکنہ معانی اور تلازمات کو دریافت کرنا اور اس طرح اپنی قوتِ اظہار کو آزمانے اور اسے مہمیز کرنے کی کوشش آج بہت سے شاعروں کے ہاں ملتی ہے۔ جس سے غزل کی دنیا اپنے اندر اندرنئی وسعتیں حاصل کر رہی ہے۔

اب ہمارے ہاں صحتِ زبان کی اہمیت کو قبول کرتے ہوئے بھی اس کے تعین کے پیمانے وہ نہیں رہے جو ہوا کرتے تھے۔ زبان کے معیار کی تصدیق کے لئے اب دہلوی اور لکھنوی اساتذہ موجود نہیں۔ اردو جیسی زبان جو ہندو پاک کے مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے جامد اور بے لچک نہیں رہ سکتی۔ وہ اب مختلف علاقائی زبانوں عوامی ادب کی روایتوں، مذہبی قدروں سے اثرات لے کر نئے الفاظ محاورے کہاوتیں اور اظہار کے پیرائے اپناتی ہے۔ جذب وقبول کی اس صلاحیت نے ہمارے ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ جو فکشن میں تیز رفتار مگر شاعری میں دھیمے دھیمے اور غزل

میں اور دھیمے آیا ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خواہ معیار ساز ادارے نہ ہوں اور اساتذہ کا سکہ چلنا بھی بند ہوگیا ہو۔ مگر یہ سب ہمارے ادبی کلچر پر اتنا اثر ڈال چکے ہیں کہ ہماری نفسیات میں کہیں نہ کہیں معیاروں کا ایک تصور ضرور باقی ہے، جو بسا اوقات حاوی رہتا ہے۔ جس کی بنا پر زبان کے استعمال میں آزادیاں لینے کے باوجود ہمارے شاعر بالکل بے سمت و بے جہت نہیں ہوئے۔ ہمارے شعروادب ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے طرز کے خلاف عام بول چال کی زبان سے ایک فاصلہ ضرور قائم کیئے ہوئے ہیں۔ ہماری آج کی غزل کی زبان پہلے سے زیادہ کھلی ہونے کے باوجود اردو کے اس مزاج سے ہٹی ہوئی نہیں جسے بنانے میں خود غزل کا بہت اہم حصہ ہے۔ مگر اردو کی اپنی لسانی ساخت دوسری زبانوں کی طرح اختراعات کے لئے بھی واقفیت اور مہارت کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے بغیر انحراف یا اختراع نہیں بلکہ عجز بیان ہی ہوگا۔ ہماری غزل میں انفرادی اختراعات آج زیادہ ہیں اور علاقائی سرچشموں سے استفادہ نے غزل کو بھی ایک تازگی عطا کی ہے۔ پاکستان میں ظفر اقبال اور ہمارے ہاں شجاع خاور کی غزل کا یہ پہلو قابل لحاظ ہے۔

ایک اور اہم بات جو عصرِ حاضر کی غزل میں خاص طور سے قابل ذکر ہے وہ بے راست بے روک ٹوک، بے باک اور بعض اوقات کھردرا سا انداز۔ پہلے غزل میں نرم شیریں الفاظ اور دھیمے ملائم لہجے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ شائستگی کا ہماری تہذیب میں ایک خاص تصور تھا اس کا غزل میں سب سے زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ آج اس رکھ رکھاو کی وہ اہمیت نہیں رہی بلکہ بے محابا بات کہنا اور اس طرح کہنا کہ سننے والے چونک جائیں زیادہ اچھا سمجھا جاتا ہے۔ تلخ، ناگوار اور زندگی کی بے ہنگم برہنہ سچائیوں کو مخملیں غلافوں میں لپیٹ کر پیش کرنے کی بجائے اس طرح کہنا کہ سننے والا خود کو بہت قریب محسوس کرے زیادہ اہم ہے۔

لوگ ہر شخص کو اپنے ہی پہ کرتے ہیں قیاس
میں جب آسودہ نہیں تھا تو پریشان تھا بہت
کائنات اور ذات میں کچھ چل رہی ہے آج کل
جب سے اندر شور ہے باہر ہے سناٹا بہت
شجاع خاور

یہ کہہ دینا کہ ان سے کچھ گلہ شکوہ نہیں مجھکو
مگر کچھ لوگ یونہی بے سبب اچھے نہیں لگتے
شمیم حنفی

محبت دنیا میں ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔ شاعری خصوصاً غزل حسن وعشق کے تقاضوں سے کیسے عاری ہو سکتی ہے۔ آج بھی اس کی جلوہ گری کم نہیں ہوئی۔ مگر اب حسن وعشق کے معاملات پہلے کی طرح محض خالص رومان کے غبار رنگیں میں لپیٹے ہوئے نہیں بلکہ آج کی زندگی میں انسانی رشتوں کی حقیقی پیچیدگیوں سے آنکھیں چار کرتے ہیں۔ سماجیاتی تبدیلیوں کی بدولت نظارۂ پس چلمن اور جلوۂ بالائے بام اب داستان پارینہ بن چکے ہیں۔ اس کا ایک اہم پہلو جو آج کی غزل میں نمایاں ہوا ہے وہ ہے غزل کا روایتی جنس سے آزاد ہونا۔ اور اس سلسلے میں پروین شاکر، کشور ناہید، زہرہ نگار اور ان کے علاوہ بھی دوسروں نے عورت کے وجود کی سچائیوں کو غزل میں سمو کر اس کا پورا مزاج بدل دیا ہے۔ ہماری غزل آج کی زندگی کے کرب ومسرت کے اظہار میں پہلے سے بہت زیادہ بے باک وبے تکلف ہے۔ اور اس کے اشعار ویسی ہی خوشگوار فضا لے کر آئے ہیں جیسی کہ ہماری غزل کی روایت رہی ہے اور غزل کی یہی فطرت مستقبل کے امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔

نئی غزل کے پیش رو

(فانی، اصغر، حسرت، جگر)

تاریخ ادب کے تسلسل میں اگر آج کی غزل کو دیکھا جائے تو اس کے چار اہم پیش رو، فانی اصغر، حسرت اور جگر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں ریاض، جلال، عزیز، ثاقب، صفی اور آرزو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ بھی اس روایت سے وابستہ ہیں جس نے غزل کے کلاسیکی اور جدید دور کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت حاصل کر لی۔ چنانچہ اس دور کی غزل کے مطالعے میں اس سارے تناظر کو مدنظر رکھنا لازم ہے۔ جس میں یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں خواہ ہم اپنے مطالعے میں مرکزی اہمیت ان میں سے کسی کو بھی دیں۔

غالب کے عہد کے بعد کئی بار یہ سمجھا گیا کہ غزل اپنے سارے امکانات پوری کر چکی، اور اس کی طرف زیادہ توجہ دنیا تخلیقی صلاحیتوں کو گھونٹنا روایتی شعر کہنے والے کم تر شاعروں کی ذہنی کاہلی اور سہل پسندی کی ہمت افزائی کرنا یا روز بروز پست ہوتے ہوئے مذاق عام کو ایک سہارا دینا ہوگا۔ مگر اس کے باوجود ہر دور میں نہ صرف اچھی غزل ظہور میں آئی بلکہ غزل کی روایت کا فروغ کچھ اس طرح ہوا کہ وہ تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے ذہن و ادراک کا ساتھ دے سکی۔ غزل پر یہ آفت نظری تنقید کے چند اصولوں کے ایسے اطلاق کی بنا پر آئی جس میں تخلیقی عمل کو اس کے اصل سیاق و سباق سے الگ کر کے دیکھا گیا تھا۔ حالی، عظمت اللہ خاں، کلیم الدین احمد اور بعض دوسرے ناقدین کے باوجود ان ہی ادوار میں غزل نے ارتقاء کی نئی منزلیں سر کیں۔ اور در حقیقت کوئی بھی دور ایسا نہ آیا جب غزل کی اہمیت واقعی کم ہوئی ہو غزل کے ردو قبول کی بحث صرف تنقید تک ہی محدود رہی۔ غزل کے اس فروغ کا سبب ہی دراصل وہ ہے جس کے مفروضہ فقدان کو غزل کے لیے جان لیوا سمجھا گیا یعنی بدلتی ہوئی تہذیبی زندگی میں پیدا ہونے والی جذباتی اور حسی فضا

کا غزل کو ساز گار آنا۔ غزل کی داخلی ساخت میں اگر تغیر پذیر ذہن و احساس کے اظہار کی صلاحیت نہ ہوتی تو وہ ختم ہو گئی ہوتی۔ مگر ایسا ہوا نہیں۔ غزل ہر دور کے بہترین جمالیاتی تجربات کو سمو لینے کے قابل بنتی رہی۔ غزل کی ہیئت اور اس کی خارجی ساخت میں تجربے کی گنجائش نہ تھی۔ تخلیقی ذہنوں کی تمام تر آزمائشوں کا میدان غزل کا داخلی نظام ہی تھا۔ چنانچہ اگر کم تر صلاحیت رکھنے والوں کو غزل کا ایک سیدھا سادا آسان سا فارمولا ہاتھ آجاتا تھا تو خلاق شاعروں کے لیے غزل کی ہئیت ہی ایک بڑا چیلنج تھی۔ اس کے برعکس اسی زمانے میں نظم میں ہیئت کے تجربات اور بنے بنائے سانچوں کو توڑنے اور نئے نئے Pattern بنانے کی گنجائش بہت زیادہ تھی۔ غزل کی ہئیت ہی اس کے دفاع کا بھی سبب بنی اور اسی کی بدولت اس کی داخلی دنیا کی پہنائیاں اور تہہ داریاں بڑھتی چلی گئیں۔

اگر ادبی تاریخ کا کوئی دور کسی ایک شخصیت کے نام سے منسوب کیا جاسکتا ہو تو فانی، اصغر حسرت اور جگر کے دور کو دراصل اقبال کے عروج کا دور کہا جانا چاہیے۔ اقبال کی شاعری میں جو قوت و عظمت تھی اور اسے جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی بنا پر بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ ان کے سامنے کسی کا بھی چراغ جلنا مشکل تھا۔ اگر اس میں روشنی کا اپنا سر چشمہ نہ ہوتا۔ چنانچہ اس دور کے غزل گو شعرا میں خود اپنا چراغ جلا لینے والے وہی ہو سکتے تھے جن کی غزل میں فنی کمال کے ساتھ ساتھ اس عہد کی فکری اور جذباتی فضا سے کسی نہ کسی قسم کی ہم آہنگی بھی ہوتی۔ فانی، اصغر، حسرت اور جگر بحیثیت شاعر باقی رہ جانے سے ہی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے ہاں کچھ تو تھا جس نے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تمازت کے باوجود ان کی اپنی روشنیوں کی جگ مگ کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ ان چراغوں سے اور بھی چراغ جلے۔

غالب کے عہد سے ہی زندگی کی پیچیدگیوں نے ایسے سوالات کو جنم دیا جن کا کوئی دوٹوک جواب آسانی سے نہیں دیا جاسکتا تھا۔ غالب قدیم و جدید کے درمیان ششدر و حیران کھڑے تھے۔ بزرگوں کی بتائی ہوئی باتوں پر شک کرتے تھے اور سوال کرتے تھے۔ غالب کا زمانہ گزرنے کے بعد زندگی کا دھارا ایک نئی سمت میں بہنے لگا۔ اور جب زندگی اس ڈھرّے پر چل نکلی تو کچھ نئے سوالات پیدا ہوئے جن لوگوں نے ان کے جواب دیئے اور ان کی روشنی میں اپنے فن کو ڈھالنے کی کوشش کی ان میں اقبال سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اقبال نے تو جواب پالیا تھا خواہ

ہمارے لیے یا خود ان کے زمانے کے بہت سے لوگوں کے لیے وہ تسلی بخش ہو یا نہ ہو۔ دوٹوک سوال کرنے اور واضح جواب دینے کے لیے نئی سمتوں میں اٹھنے والی نظر درکار تھی مگر جو لوگ نئی سمتوں میں نظر نہیں کر سکتے تھے یا جو کچھ دیکھ رہے تھے اس کا پورے طور پر احاطہ نہیں کر سکتے تھے وہ بہر حال اپنے عہد میں ذہنی اور جذباتی طور پر سرگرم تھے اور ہر بات کا ردعمل مجموعی طور پر قبول کرتے تھے۔ خواہ اس کا ادراک و اظہار واضح شکل میں بہت اعلیٰ سطح سے نہ کرسکیں۔ ہر بات کو صاف طور سے دیکھ لینا اور اس کا واضح اظہار کرنا سب کے لیے لازم بھی نہیں۔ مبہم اشارے، دور سے آنے والی دھیمی آوازیں، موہوم امیدیں ان دیکھے خدشات اپنا بھرپور وجود اور اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ فانؔی، اصغرؔ، حسرتؔ اور جگرؔ کے کلاسیکی طرز کی بنیادیں اسی احساس پر قائم ہیں۔ اس میں مفکرانہ یک سوئی اور صلاحیت تو نہیں مگر فکر کا رجحان ضرور نمایاں ہے۔ مشرق و مغرب کے فلسفوں اور انقلابات کی تاریخ پر مستقبل کے امکانات پر ان کی نظر نہ سہی مگر وہ جس زمانے میں رہ رہے تھے اور جو زندگی وہ خود گزار رہے تھے، اس میں اپنے وجدان کے ذریعے موہوم اشاروں کو اپنی گرفت میں لے لینا کتنا ہی مشکل ہو، اس سے کسی نہ کسی قسم کا اثر قبول کرنا لازم تھا۔ پھر حسرت اور جگر، اس معاملے میں فانی اور اصغر سے مختلف تھے حسرت اور جگر نے جو زمانہ دیکھا اس میں ہر شخص کی زندگی میں سیاست کے اثرات کسی نہ کسی طرح در آئے تھے۔ حسرت تو یوں بھی تمام عمر سیاست میں سرگرم رہے اور جگر کی شخصیت اور طرز فکر میں وقت کے ساتھ ساتھ زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ شعلۂ طور کے جگر سے آتش گل کے جگر تک تبدیلیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ حسرت نے اسلامی تصوف اور سوشلزم میں اپنے عہد کے مسائل کا حل پالیا تھا۔ جگر نے اتنی وضاحت کے ساتھ کسی نئے نظام زندگی کی طرف اشارہ تو نہیں کیا مگر اپنے عہد کے حالات پر خصوصاً تقسیم ملک کے بعد کے زمانے کے بارے میں جو اشعار کہے ان میں ان کا نقطۂ نظر واضح ہے چنانچہ ان سب لوگوں کا شعور واحساس خواہ وہ واضح ہو یا مبہم، ان کی شاعری میں چھلک آیا انھوں نے اپنی ذات اور زمانے کے اس رشتے کا فنی اظہار غزل کے ذریعے کیا۔ زندگی کی پیچیدگیوں کا تجزیہ اور ان کے حل کی تلاش اقبال کی طرح تو اس عہد میں کوئی نہ کرسکا مگر فانی کا غم اور اصغر کے متصوفانہ تخیل کی رنگینی ورعنائی سطحی بھی نہیں بلکہ پہلی نظر میں ہی ہمیں اپنی گہرائیوں میں اتار لے جاتی ہے۔ فانی کے ہاں موت ایک انفرادی ردعمل اور سارے غموں کا وجدانی حل ہے جو خواہ کتنا ہی ناقابل یقین کیوں نہ ہو۔

اپنے زمانے کا ایک شخصی اظہار تو ہے، جو نہایت حسین، دل دوز اور موٴثر آواز میں ہم تک پہنچتا ہے۔ یہ ایک شاعرانہ اظہار ہے اس حقیقت کا کہ بسا اوقات زمانے کی تیز رفتاری فرد کی شخصیت اور اس کے پورے نظامِ احساس کو اس حد تک گھائل کر دیتی ہے کہ وہ اپنے اندر ہی اندر خود کو آزاد کرنے کے وسائل تلاش کرتا ہے۔ موت کا یہ روپ ایک فرد کے Passive احتجاج اور خود کو سب سے الگ دیکھنے کے غرور کو بھی ظاہر کرتا ہے جو ہماری شاعری میں فانی کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتا، شاید آ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس دور سے پہلے اگر بے بسی تھی بھی تو اس کا ایک عام طور سے مانا ہوا رومانی حل تصوف نے بہم پہونچا دیا تھا۔ جو اس عہد میں ملتا تو سب ہی غزل گویوں کے ہاں ہے مگر سب سے زیادہ نمایاں اصغر کے یہاں نظر آتا ہے۔ اصغر کے ہاں موت کی جگہ 'جنوں' نے لے لی ہے جو موت کو غیر اہم مگر زندگی کو رنگین اور دل آسا بنا دیتا ہے۔

جو غم ملا اسے غمِ جاناں بنا دیا

فانی کی شاعری میں غم اور موت کا تصور گوارا، سنجیدہ اور بڑا Convincing بن جاتا ہے۔ یہ تصور زندگی کے حل نہ ہو سکنے والے سوالات سے وابستہ ہے جس کے جلو میں ایک دنیا چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

زندگی اور اس کے مسائل کو نئے سرے سے معرض بحث میں لانا اس کے تسلیم شدہ حل کی جگہ کوئی نئی راہ ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرنا ایک نئی بات تھی جو اس دور کی غزل میں ملتی ہے۔

فانی کے غم کی طرح اصغؔر کا تصوف بھی ان کی شخصیت اور ذاتی زندگی پر مبنی ہے جہاں تک زندگی کی مصیبتوں اور سختیوں کو جھیلنے کا تعلق ہے، حسرت سے زیادہ کون ہوگا جسے یہ فخر نصیب ہوا ہے۔ مگر حسرتؔ کی شاعری میں اس کی رمق بھی نہیں ملتی ان کے ہاں آسائش کا تصور ہی کچھ اور تھا ایسی سخت زندگی کے باوجود 'عیش بافراغت کے مزے' اور اس کی حسین یادیں ان کی شاعری کی جان ہیں۔ شاید چکی کی مشقت اور مشق سخن دونوں ان کے ہاں ایک دوسرے کو توازن عطا کرتی ہیں۔ محض چکی کی مشقت صرف معمولی سیاسی شاعری کو جنم دے سکتی تھی جس کی جھلک بھی ان کے ہاں ملتی ہے اور محض شق سخن وہ بھی عاشقانہ قسم کے طرز میں معمولی پن تک لے جا سکتی تھی مگر ان کی شخصیت کے یہ دو سرے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ کر اعتدال کی ایک لکیر بنا دیتے ہیں جہاں

سے حسرت اگر ملتے بھی ہیں تو بس کم کم۔ دراصل غم روزگار غم عشق، غریب الوطنی کی اہمیت نجی زندگی میں ہوتی ہے، یہ سب فکر و احساس کو بنانے، سنوارنے یا بگاڑنے میں حصہ لیتے ہیں مگر بات یہیں تک رک نہیں جاتی۔ یہ کچے تجربات، تخلیق کے محرک بننے میں تجزیے، وجدان اور عرفان کی منزلوں سے گزر کر اظہار تک پہنچتے پہنچتے اپنی نوعیت بالکل بدل لیتے ہیں۔ بالآخر موت اور فانی کی زندگی کے درمیان براہ راست کوئی واسطہ نہیں رہ جاتا اسی طرح نشاطِ زیست اور حسرتؔ کی سخت زندگی کے درمیان بھی کوئی سیدھا تعلق نہیں ہوتا جیسا کہ ان کی شاعری ثابت کرتی ہے جہاں آپ بیتی اور تخلیق کا تعلق بالکل راست طور پر ہوتا ہے وہاں تخلیق بھی عموماً سطحی ہو جاتی ہے جیسے جگر کی رندی اور سرمستی والی شاعری جس میں لطف تو ہے مگر قائم رہنے والا نہیں۔ یہ نشہ سننے والوں کو تھوڑی دیر کے لیے سرشار تو کر دیتا ہے مگر جاری و ساری نہیں رہتا۔ فانیؔ کے غم اور مرگ پرستی، اصغرؔ کے تصوف اور حسرتؔ کے ہاں سیلاب نشاط کو قائم اور دائم رکھنے والی شے زندگی کے تجربات سے ان کا لمحاتی اور اضطراری تعلق نہیں بلکہ ایک مجموعی Preception ہے۔ جس میں زمانہ زندگی فکر و منطق، شعری روایت، غزل کے صنفی تقاضے غرض کہ سب ہی کچھ شامل ہیں۔ اس عہد کے شاعر کے لیے خواہ زندگی دیوانے کے خواب ہو۔ خواہ نظام جہاں کی شورشیں بھی انسان کے بھیس میں آتی ہوں، یا فکر جمیل خواب پریشاں کرنے والے عناصر گھات میں لگے ہوئے دکھائی دیتے ہوں، مگر یہ سوالات محض کسی رد میں نہیں اٹھتے یہ زندگی کے تجربات سے اٹھتے ہیں اور بار بار اٹھتے ہیں جواب نہیں ملتا تو شاعر کو جانے بوجھے گوشوں میں لوٹ جانا پڑتا ہے۔ یہاں تصوف کا ابہام فکر کو بھی سہارا دیتا ہے اور اظہار کو بھی۔ چنانچہ اس دور کی شاعری میں تصوف کا نمایاں ہونا محض اس حقیقت کا اشاریہ ہے کہ نیا ذہن ابھی پورے طور پر بنا نہیں بلکہ پرانا ذہن نئے پن کی تلاش میں پھرتا ہے، پرانے گوشوں میں بار بار جاتا ہے اور ایک مبہم سی فضا میں اپنا سہارا پا جاتا ہے بہ ظاہر یہ آلامِ روزگار کو آساں بنانے کا ایک طریقہ ہے مگر ایک اندرونی جدو جہد کا اشاریہ بھی ہے جو شاعر کے قلب و ذہن میں جاری ہے۔ اس دور میں تصوف زندگی کی پیچیدگیوں کا ایک مبہم جواب ہے۔ اٹھارویں انیسویں صدی کی زندگی کی بے ثباتی اور ترک دنیا کے عناصر اپنا روپ بدل لیتے ہیں کیوں کہ اب زندگی میں وہ ناپائیداری اور بے یقینی نہیں بلکہ ایک یقین ہے یقین کہ دنیا میں ایسی تبدیلیاں آرہی ہیں جن کا اس سے پہلے کسی نے اندازہ نہیں کیا تھا۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کدھر جا رہی ہے ہاں!

دنیا جدھر جاری ہے ادھر وہ جانا چاہتا ہے، جا سکتا ہے یا نہیں یہ مسئلہ دل میں ہل چل پیدا کرتا ہے اور اس کا جواب نہ پانے یا موہوم اشارہ پا لینے پر اس کا ذہن حیات و کائنات کے مسائل کا حل تصوف میں ڈھونڈھنے لگتا ہے۔ اس دور کی غزل میں کلاسیکیت کا یہ لازمی جزو ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر کا تصوف سے کوئی واسطہ نہیں مگر غزل کہتے وقت اسے زبان ملتی ہے تو تصوف سے۔ ان لوگوں کے ہاں غالب سے قریب ہونے کی خواہش یا ان کے طرز پر شعر کہنے کی کوشش کا بھی اگر کوئی سبب نظر آتا ہے تو وہ یہی کہ غالبؔ اپنے عہد کو بدلتا ہوا دیکھ کر اپنی فکر و دانش کے مطابق تو نئے زمانے کا خیر مقدم کرتے ہیں مگر جذباتی طور پر وہ خلعت و خطاب سے چمٹے ہوئے ہیں۔ پھر بھی جب مجموعی طور پر زندگی کی رفتار کو دیکھتے ہیں تو حیرت و تشکیک میں پڑ جاتے ہیں جو ایک فطری اور ایماندارانہ رویہ تھا۔ یہی باتیں فانیؔ اور اصغرؔ کو غالبؔ سے قریب تر کر دیتی ہیں اور یہی وہ عنصر ہے جو ان کے بعد پھر ابھرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں غالبؔ اور ان کے بعد کے عہد میں کوئی میکانکی رشتہ نہیں نہ محض ان کی بے سبب مقبولیت کی بنا پر اس عہد کے شاعروں نے خود کو ان سے قریب پایا بلکہ ان کے کلام کی جذباتی اور حسی قوت ہی انھیں آنے والے دور کی جذباتی اور حسی فضا سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔

تصوف اور عشق کو کلاسیکی طرز کی غزل محض اس لیے راس آئی کہ غزل اپنی صنفی خصوصیات کی بنا پر مبہم احساسات کو کچھ اس طرح قابل فہم اور دل کش بنا دیتی ہے کہ منطقی سوالات کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے پھر شاعری کی تمام اصناف میں یہ شاعر اور سامع کے درمیان شخصی ابلاغ پر سب سے زیادہ انحصار کرتی ہے۔ چنانچہ بے شمار ان کہی باتیں اور نہ پُر ہونے والے خلا خود بخود شاعر اور سامع کے اس خاموش مگر سرگرم رشتے کی بدولت پُر ہو جاتے ہیں۔ تصوف اور عشق یہ دو ایسے موضوعات ہیں جو لازماً فرد کی نجی کیفیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں راز ہیں اور راز داں کا تقاضا کرتے ہیں اور غزل میں یہ دونوں ہم کنار ہو جاتے ہیں۔ فانیؔ، اصغرؔ، حسرتؔ اور جگرؔ جس معاشرے میں پلے بڑھے تھے اس میں پرانی اقدار حاوی تھیں مگر دھیرے دھیرے بدل رہی تھیں۔ اقبال کی طرح عشق کی ایک جست میں تمام قصہ طے کر دینے کی بجائے وہ آہستہ آہستہ اثر قبول کر رہے تھے نئے احساس کے چھینٹے کے باوجود ان کے مزاج پر غلبہ کلاسیکیت کا تھا۔ فنی نقطۂ نظر سے غزل کی اسی روایت کو انھوں نے قبول کیا جو پہلے سے موجود تھی زبان و بیان کا سارا نظام ان

تک ڈھلا ڈھلایا پہنچا تھا۔ان سے قبل داغ شاعرانہ اظہار کی زبان کو ایک معیار تک لے جا چکے تھے جو اب ملک گیر تھا۔اس سے بچ نکلنا کسی کے لیے بھی نہ ممکن تھا نہ فائدہ مند۔ چنانچہ ان شعرا کے مزاج کو بھی غزل کی یہی روایت راس آئی اور انھوں نے اپنی بساط کے مطابق اسی کے اندر وہ امکانات بھی تلاش کر لیے جو ان کے شخصی امتیازات کا سبب بن سکے۔تصوف،عشق اور اس کے متعلقات اگر زندگی کو آسان اور رنگین بنانے کا وسیلہ تھے تو اس کے سائے میں تربیت پائے ہوئے مزاجوں کے اظہار کا سب سے خوب صورت پیرایہ غزل فراہم کرتی تھی۔غزل دراصل ان کی ضرورت بن گئی تھی۔

کلیم الدین احمد نے اس عہد کی غزل کو جدید غزل قرار دیا ہے اور علیست و ادبیت کو اس کی امتیازی صفات بتایا ہے جن کی بدولت نئی لفظیات، تراکیب اور استعاروں کا غزل میں اضافہ ہوا اور جن سے ایک نئے ذہن کی آمد آمد کا پتہ چلتا ہے۔میرے خیال میں اس غزل میں ایک صفت اور بھی ہے اور وہ راست اظہار یا Directness جو اس کے بعد کی امتیازی صفت بن چکی ہے۔ یہ وہم اب ہمیشہ کیلئے ٹوٹ چکا ہے کہ غزل میں بات جب تک چھپا کر نہ کہی جائے تب تک قابل قبول نہیں ہوتی Directness اس دور کے سب ہی شعرا کے ہاں کسی نہ کسی حد تک ملتی ہے مگر حسرت کے ہاں یہ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔وہ سیاسی موضوعات سے لے کر عشق تک ہر بات بے محابا کہتے ہیں۔عشق کے نازک ترین معاملات بھی جنھیں استعاروں اور کنایوں میں کہنا ہی مناسب سمجھا جاتا تھا۔حسرت کھل کر کہتے ہیں اور بے لاگ کہتے ہیں۔ان کے دل میں کوئی چور نہیں۔اسی لیے وہ جو کچھ کہتے ہیں۔اس میں معصومیت کے ساتھ خود پر اختیار بھی ہوتا ہے جو انھیں ابتذال کی حدوں سے پہلے ہی روک دیتا ہے۔فانی،اصغر اور جگر کے ہاں زندگی اور دنیا کے معاملات بھی شاعرانہ احساس پر پورا اثر ڈالتے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ ہماری غزل میں زندگی سے متعلق متنوع مضامین ہمیشہ رہے ہیں مگر اس دور سے پہلے اکثر وہ اس طرح آئے ہیں کہ دنیا کے معاملات تو درکنار حقیقی اور مجازی عشق میں پہچان ناممکن ہو جاتی ہے۔تہذیب کی پابندیاں آڑے آتی تھیں اس لیے شاعر یہ صورت حال اپنے لیے مناسب (Convenenient) بھی سمجھتا تھا۔اس دور میں یہ حصار ٹوٹنے لگتا ہے یہاں بھی حسرت اور جگر کی عشقیہ شاعری اپنے عہد میں سب سے ممتاز ہے۔خصوصاً حسرت کے ہاں ہندوستانی مسلم مشترکہ خاندان میں پلنے بڑھنے والے نو جوان مردوں اور عورتوں کے نازک ترین رشتوں اور احساسات کا اتنا کھلا ہوا اور خوب صورت اظہار اس

سے پہلے کہیں نہیں ملتا۔ اردو شاعری میں اس سے پہلے عاشق تو ضرور ملتا تھا۔ مگر محبوبہ کا وجود ناپید تھا۔ مثنویوں میں اگر بھولے سے کوئی شریف عورت آبھی گئی تو کہتی تھی کہ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔

مگر اب ان معاشرتی تبدیلیوں کا اظہار غزل میں بھی نظر آنے لگا۔

آج غزل کی دنیا بدل چکی ہے۔ مگر اس تبدیلی کی پہلی پہلی آہٹیں دراصل اسی دور میں سنائی دی تھیں۔

عصر حاضر میں تنقید

جب کسی زبان کے ادب میں تخلیق سے زیادہ تنقید کا چرچا ہونے لگے تو تشویش تو ہونی چاہیے اور گذشتہ برسوں میں ہمارے ہاں یہ رجحان بڑھتا رہا ہے۔ تنقید کی مقبولیت کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کے بارے میں جو کچھ بھی نثر میں لکھ دیا جائے اسے تنقید کہا جانے لگا۔ کسی کتب خانے میں چلے جایئے اردو تنقید کی الماریوں پر نظر ڈالیے۔ آپ کو دنیا کی ہر شے تنقید کے نام پر نظر آئے گی۔ تنقید کی اس گرم بازاری کا سبب ہماری سہل پسندی اور اسے فروغ دینے والے حالات ہیں۔ کتابوں کا چھپنا سہل ان کے لیے رسائل حاصل کرنا سہل، انعام حاصل کرنا بھی سہل۔ جس نے اب بڑی حد تک رائلٹی کی جگہ لے لی ہے۔ غرض کہ ایک عجیب وغریب صورت حال ہے۔ زبان کی عمومی صورت حال اور کتابوں کی اشاعت کی تعداد اور رفتار میں کوئی مطابقت نہیں۔ خصوصاً یونیورسٹی کے ایم اے اور ایم فل کے طلبہ کی ہر تحریر تنقید کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہے۔ چنانچہ عام تصور کے مطابق تنقید کے تناسب میں اور زیادہ اضافہ نظر آتا ہے جس کی ادبی اور علمی منطق نہیں۔

ایسا ہرگز نہیں کہ تنقید جسے واقعی تنقید کہا جائے بالکل غائب ہوگئی ہو۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے زیر اثر وجود میں آنے والی تنقید نے ادب کی بصیرت میں اضافہ کیا ہے۔ ترقی پسند تنقید کا نقطۂ عروج احتشام حسین صاحب تھے جو نہ صرف مدتوں اردو تنقید کی دنیا میں حاوی رہے بلکہ آج تک ترقی پسند حلقے میں ان کی تنقید کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ سرور صاحب نے ترقی پسندی کے ذریعے آئے ہوئے اثرات کو قبول کرتے ہوئے دوسرے تنقیدی تصورات کا بھی خیر مقدم کیا۔ کلیم الدین احمد نے مغربی تنقید کے معیاروں کو اردو پر منطبق کر کے گویا اسے عالمی معیاروں پر پرکھنے کی کوشش کی۔ اردو شاعری خصوصاً غزل کے بارے میں اپنی انتہا پسندی کے باوجود مجموعی طور پر انھوں نے ادب کی تفہیم اور پرکھ کو ایک نئی منزل تک پہنچایا۔ ان کے بعد کی نسل نے تنقید کو بہت فروغ دیا مگر اس عہد کے

نقادوں کی خاصی قوت و ذہانت ترقی پسندی اور جدیدیت کی چشمک کی نذر ہوگئی۔ اس چشمک میں ترقی پسندی کا مدافعانہ اور جدیدیت کا جارحانہ رویہ عام طور پر نمایاں رہا۔ ترقی پسندی احتشام حسین، سجاد ظہیر کے دور کے دیے ہوئے سرمایے کے گرد گھومتی رہی، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر محمد عقیل نے اپنے مطالعات کے ذریعہ ترقی پسندی کو روایت کی چار دیواری میں قید ہونے سے بچانے کی کوشش کی مگر اس کا اثر اب نظر نہیں آتا جو ترقی پسندی کے عروج کے زمانے میں تنقید کا تھا۔ جدیدیت مغرب کے مختلف غیر مارکسی، نو مارکسی ادبی دبستانوں سے ادھار لیے ہوئے تصورات سے کام چلاتی رہی۔ نئی لفظیات ترجمے کیے ہوئے یا اخذ کیے ہوئے فقرے بازی اور تنقید کا ایک نیا اسلوب جو اوپر اوپر سے مرعوب کن چل گیا اور بعد کی تحریروں میں اس کا گہرا اثر یکسانیت کی حد تک پایا جاتا ہے۔

اس عہد میں کئی ایسے نقاد ابھرے جن کے ہاں مستقل ایک نشو و نما اور علم و ادب کے نئے نئے گوشوں کی جستجو ہے۔ ان میں سب سے پہلے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب ہیں جنھوں نے اردو میں جدیدیت کو خاص طور سے فروغ دیا ان کے زیر سایہ بہت سے انتہا پسند مصنفین اور ادیب و شاعر پنپے بھی مگر خود ٹھہرے نہیں رہے۔ انھوں نے اردو کے کلاسیکی ادب، شعریات اور مغربی ادب اور شعریات پر اردو میں جو آگاہی بہم پہنچایا ہے وہ ان سے پہلے نہیں تھا۔

یونیورسٹیوں میں تحقیق و تنقید کا سلسلہ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ جب سے ملازمت اور ترقی کی شرط یہ ٹھہری کہ ہر امیدوار پی۔ ایچ۔ ڈی ضرور ہو اور اس کے ہاتھ میں اس کی اپنی شائع شدہ کتابوں کا انبار ہو تب سے کتابوں کے ڈھیر آنے لگے۔ اس قبیل کی کتابوں میں اونچ نیچ بہت ملے گی مگر غنیمت ہے کہ اس بہانے کچھ نہ کچھ کام ہو رہا ہے۔ مقالات کی کتابیات سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم مطالعے کا دائرہ ضرور بڑھ رہا ہے جسے خوش آیند کہنا چاہیے مگر اس طرح حیات اور کارنامے اور ادبی خدمات کے عنوانات کے تحت غیر ضروری اور تھکا دینے والے ''تہنیت نامے'' اگر ایک طرف اس لائق ہیں کہ انھیں نظر انداز کر دیا جائے تو دوسری طرف تقابلی مطالعے اور مختلف علوم سے استفادے کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے۔ ان کی اپنی لاکھ خامیاں سہی یہ امید کرنا غلط نہ ہوگا کہ اگر ان بنیادوں پر آیندہ کارآمد اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

غیر ملکی زبانوں خصوصاً انگریزی میں اردو ادب کے متعلق جو کام ہو رہا ہے وہ نہایت اہم ہے۔ قدیم و جدید ادب پر مقالات کا ایک قابل قدر ذخیرہ ہر سال سامنے آتا ہے۔ مآخذ کی تلاش

اور نشاندہی حقائق اور شواہد کا تجزیہ اور قدیم و جدید ادب کے نئے نئے بلکہ ان دیکھے گوشوں میں سفر کرنا اور جدید علوم کی روشنی میں تہذیب کے تناظر میں انھیں جانچنا تحقیق کے اس اعلیٰ معیار کو ہمارے ہاں پیش کرتا ہے جس سے ہماری یونیورسٹیوں کے نو آموز محققین بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ لائبریریوں اور اشاعت گھروں میں تو یہ کتابیں حاصل ہوتی ہی ہیں۔ آج کل کمپیوٹر نے بین اقوامی رابطے کے جو راستے نکالے ہیں ان سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے نوجوان محقق اردو کی حدود کے باہر نہیں جاتے اور انگریزی زبان سے اس زمانے میں عام طور سے ناواقفیت بھی افسوس ناک ہے۔ ان کتابوں اور مقالوں کے ذریعہ اپنے ادب اور تہذیب کی نئی جہات اور ہم عصر نظریات کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو ادب میں تانیثیت کے بارے میں انگریزی میں جو کچھ دستیاب ہے وہ اردو میں نہیں۔

سیمناروں کی روایت بھی مشاعروں کی طرح اب ہمارے ہاں مستقل حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اچھے بُرے ہر طرح کے سیمینار ہوتے ہیں۔ ان کی بدولت بہت سے نئے لکھنے والے سامنے آتے ہیں۔ سیمیناروں کا مقصد ہوتا ہے نئے سوالات اٹھانا۔ اپنے خیالات کو دوسروں کی جانچ اور پرکھ کے لیے پیش کرنا، مباحث کا اٹھنا اور ان سے غور و فکر اور مطالعے کے لیے نئے پہلوؤں کا سامنے آنا مگر ہمارے ہماں یہ سب کچھ دور کی باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ سیمینار کی نظامت کرنے والے نوجوان، مقالہ نگاروں کو جن تعریفی کلمات کے ساتھ آواز دیتے ہیں اس کے ساتھ ہی مجلس مشاورت کی روایت اور ہر صدر کا پورے سیمینار پر سرپرستانہ خیال کا اظہار کرنا انتہائی مضحکہ خیز صورت پیدا کرتا ہے اور سیمینار بقول شخصے نثر نگاروں کا مشاعرہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ بزرگوں کی فراہم کی ہوئی معلومات اور تصورات کو چیلنج کرنا ہر نئی نسل کا اعزاز ہے۔

دراصل اردو تنقید خود اپنے تنقیدی تجزیے کی متقاضی ہے۔ اس کی طرف ہمارے ہاں سنجیدگی سے توجہ کم دی گئی۔ حال میں یونیورسٹیوں میں میر و غالب اور اقبال کی تنقید کے تنقیدی تجزیے ہوئے ہیں مگر مجموعی طور پر اردو تنقید کا سیر حال جائزہ نہیں لیا گیا۔ کبھی کبھی انفرادی طور پر کچھ فقرے بازیاں اور چشمکیں ہو جاتی ہیں مگر عام طور سے ہمارے نقاد بہت کچھ کہنے یا نہ کہنے کے بعد بے خطر بچ نکلتے ہیں۔ لگتا ہے۔ ان کے سامنے تو سب جواب دہ ہیں مگر وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں۔ وہ اتنے چوکس نہیں رہتے جتنے مثال کے طور پر قاضی عبدالودود اور ان جیسے محققوں کے ڈر سے تحقیق

کرنے والے چوکنے ہو گئے تھے اور اب تک اس سخت گیری کے اثرات نظر آتے ہیں۔ سرورالہدیٰ ''اردو میں شاعری کی تنقید'' کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا ہے جو اس اہم اور بڑے موضوع پر پہلا باضابطہ مقالہ ہے۔ اگر یہ مقالہ کتابی شکل میں آجائے تو اس سے اردو کے نقادوں کی خدمات اور ان کی زیادتیاں دونوں سامنے آجائیں گی۔

ہمارے یہاں رسائل کی کمی کی وجہ سے بھی اچھے ادب، معیاروں تبصروں اور معنی خیز بحثوں میں ایک عام محرومی رہتی ہے۔ گذشتہ برسوں میں کچھ اچھے رسالے نکلے۔ کچھ کا معیار پہلے سے بلند ہوا مگر کچھ بند بھی ہو گئے۔ دنیا کی ہر نئی زبانوں کے رسائل میں تبصروں کی تنقیدی حیثیت بہت بلند رہی ہے۔ ان کی بدولت تازہ تر رجحانات سے آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے اور بہت سے کھوئے ہوئے ادبی خزانے کی بھی بازیافت ہوتی ہے۔ ایک ہی کتاب اور موضوع کے بارے میں مختلف رائیں بھی سامنے آتی ہیں۔ ہمارے ہاں یہ سب کچھ ہے مگر اس قدر کم کہ اس کے ذریعہ ادب میں کوئی ہلچل نہیں ہوتی۔

گذ : برسوں میں ادیبوں اور شاعروں کے جشن اور تہنیتی کتابوں اور مخصوص گوشوں کا چلن بھی ع . سی ایک شخص یا کتاب یا رجحان کو مرکز میں رکھ کر اس پر گفتگو کرنا اور معتبر لوگوں کی یا عام قارمین اور سامعین کی رائیں کوئی بُری بات نہیں مگر حرف تعریف و توصیف پر ہی اکتفا کرنا ادبی دیانت کے بالکل خلاف ہے۔ ہمارے بعض بڑے نقادوں کی تنقید بھی ایسے موقعوں پر بہت نچلی سطح پر پائی جاتی ہے۔ یہ مرنجاں مرنج قسم کی تنقید دراصل اہماری تہذیبی مجبوری ہے اور ان تعلقات میں سے ہے جن کے ہم صدیوں سے عام زندگی میں بھی عادی رہے ہیں۔ یہ ابھی ختم ہونے والے نہیں۔ جس بات میں خطرہ ہو کہ ناگوار گزرے گی اس کے اظہار سے بچنا یا اس طرح کہنا کہ کچھ لطف کا پہلو نکلتا ہو اس قسم کی تنقید کی صفت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس طرح ہم عصر مصنفوں کے بارے میں جو مواد شائع ہو جاتا ہے اس میں مفید بھی ہوتا ہے جو آئندہ استعمال ہو سکتا ہے۔

ادب کی دنیا میں گروہ بندیوں کا چرچا بھی اکثر رہتا ہے۔ اس میں عموماً تنقید کا مرکزی رول رہا ہے کیونکہ کسی کے حق میں یا اس کے خلاف رائے کی تشکیل تنقیدی مضامین کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات کسی ادیب یا شاعر کی تصنیف آتے ہی اس پر مذاکرے شروع ہو جاتے ہیں یا تبصرے یا مضامین شائع ہونے لگتے ہیں۔ وہ کتاب کتنے دن زندہ رہنے والی ہے اس کا پتہ تو خاصا وقت گزر جانے کے بعد چلتا ہے۔

دانشوری کیا ہے؟

ہر زمانے میں کچھ بے چین لوگ ہوتے ہیں۔ان کی بے چینی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں محو رہتے ہیں۔جن حالات پر ساری دنیا مطمئن ہو جاتی ہے ان ہی کے اندر چھپے ہوئے وہ ایسے عناصر دیکھ لیتے ہیں جو خرابی کی طرف لے جانے والے ہیں۔اُن کے دلوں کی آگ اگر بجھ جائے تو دنیا کی رفتار ٹھہر جائے۔میرؔ نے کہا تھا

افسردگیِ سوختہ جاناں ہے قہر میرؔ

دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

میرؔ کے یہ سوختہ جاناں، دراصل ساری صفات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں جن سے دانش وری عبارت ہے۔

دانش وری ہر زمانے اور ہر زبان میں ہمیشہ رہی ہے۔مگر دانش وری کی اصطلاح زیادہ پرانی نہیں۔اردو میں دانش، علم، حکمت جیسے الفاظ ہمیشہ کسی نہ کسی ایسے مفہوم میں آتے رہے ہیں جس کے لئے آج ہم دانشوری کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔دانش ور کی اصطلاح دراصل یہاں انگریزی لفظ Intellectual کے ترجمے کے طور پر آئی اور مغرب میں بھی یہ تصور کم وبیش بالکل اسی طرح آیا جس طرح ہمارے ہاں دانشور۔

ہر زمانے میں مختلف سمتوں میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کے ساتھ علوم کی بھی ترقی ہوتی رہی ہے۔اور ایک ایسا ذہنی رویہ فروغ پاتا رہا ہے جس کی سب سے اہم خصوصیت ہے جستجو اور دریافت کی راہ پر سرگرم رہنا۔اس ذہنی رویے کی اور بھی کئی خصوصیات ہیں۔مثلاً ان سب باتوں کو جو عرصہ دراز سے مانی جاتی رہی ہیں، آنکھ بند کر کے مان لینے کی بجائے انہیں اپنے تجربوں اور

مشاہدوں کی کسوٹی پر کسنا۔اصولوں،عقیدوں اورقدروں کانظام خواہ وہ سیاست ومعیشت سے تعلق رکھتا ہو یا فلسفہ وتہذیب سے یا علم وادب سے محض اس لئے نہ قبول کرلیا جائے کہ صدیوں تک ہمارے بزرگ انہیں مانتے رہے ہیں۔ ہر ورثہ مقدس نہیں ہوتا۔مگر جن باتوں پر بہت عرصہ گزر جائے ان کا پرانا پن ہی ان کو اکثر عوام کی نظروں میں تقدیس عطا کردیتا ہے۔اوران پر سوال اٹھانا سماجی ،اخلاقی ،یامذہبی جرم سمجھا جانے لگتا ہے۔مگر دانشوری کا تقاضایہ ہے کہ ایسی سب باتوں کو نئے علوم دریافتوں، ایجادوں اور ضرورتوں کی روشنی میں پھر سے جانچا جائے۔ دلائل کی بنا پر انہیں ردوقبول کے آزادنہ عمل سے گزارا جائے ،اوراس کے نتائج پر اپنے نظریات وخیالات کی بنیاد رکھی جائے۔دانشور کسی ایک علم یا ہنر کا ماہر ہونے کے باوجود محض اسی کی حدوں میں خود کو قید نہیں رکھتا وہ اپنے مطالعہ کو دنیا کے دوسرے معاملات کے تناظر میں دیکھتا ہے۔دانش ور کا ذہنی افق اتنی دور تک پھیلا ہوا ہونا چاہئے کہ ازل اور ابد بھی اس میں سمائے ہوئے لگیں۔وہ ماضی کے معاملات اور مستقبل کے امکانات سے برابر کی دلچسپی رکھتا ہو۔خوداپنی سوجھ بوجھ جس میں اس کے عہد تک تحقیق وتجسس کا حاصل بھی شامل ہو۔

آزادخیالی اور روشن خیال کا تقاضا ہے کہ اس میں خود سے مختلف رویہ رکھنے والوں سے مقابلہ کرنے کی سکت اور قوت ہو۔جیسا کہ کہا جاچکا ہے دانشوروں کا یہ طبقہ ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں رہا ہے مگر گذشتہ چندصدیوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کے ارتقاکے ساتھ ساتھ عقلیت کے رجحان نے زیادہ فروغ پایا۔سائنس کی بنیاد ہی تجربے اور مشاہدے پر ہےاوراس کے زیراثر دانشور کا بےچین اور نامطمئن ذہن حقیقت کی تلاش اورتعین کے لئے جب ہر فکری یا معاشرتی نظام کے سارے پہلوؤں کو جانچتا ہے تو لامحالہ اس کی نظر منفی پہلوؤں پر بھی جاتی ہے۔دانش ور کا کام ان چھپے ہوئے عناصر سے متعلق اندیشوں سے آگاہ کرنا ہے۔اسی لئے وہ ہر بات پر نئے نئے سوالات قائم کرتا ہے۔اسکی بے اطمینانی کی جڑیں اس احساس سے پھوٹتی ہیں کہ دنیا کے معاملات ابھی پورے نہیں ہوئے۔اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک نظر آنے کے باوجود ایسے نہ جانے کتنے گوشے رہ جاتے ہیں جہاں اندھیرے گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں انھیں روشنی میں لانا دانش وری کا فریضہ ہے۔

انحراف، اختلاف، انکار اور پھر متبادل نظام فکر یا نظام حیات کی جستجو دانشوری کی روح ہے۔ دنیا میں کتنے نظریے اور عقائد ان لوگوں کے تمام مسائل کا حل لے کر آئے وہ عرصۂ دراز تک کامیاب بھی ہوئے مگر پھر ان کی کسی کمی نے کسی نئے نظام کے لئے زمین ہموار کی۔ تکمیل کی خواہش ہمیشہ سب کے ہاں رہی ہے مگر کوئی نظام آج تک اپنی مکمل شکل میں نہ نظر آیا۔ تکمیل کی منزل تک پہنچتے پہنچتے اس کی شکل مسخ بھی ہوتی گئی۔ سانچے بنتے ہیں، اور ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں یہ ہر زمانہ اپنے مسائل اپنے ساتھ لے کر آتا ہے اور مسائل کی طرح ان کے حل بھی پُرانے ہو جاتے ہیں۔ دانشور اس ساری صورت حال کا ادراک کرتا ہے اور دنیا کا کاروبار چلانے والوں کے کاموں میں اپنی فکر کے ذریعے مداخلت کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ اسے اس جرم میں جلاوطن بھی ہونا پڑا ہے زہر کا پیالہ بھی پینا پڑا ہے اور سولی پر بھی چڑھنا پڑا ہے۔ مگر جب اس کا کہا کسوٹی پر پورا اترتا ہے تو وہی آنے والوں کے لئے مثال بھی بن جاتا ہے۔ اور نسل در نسل دانشوروں کی رہنمائی بھی کرتا ہے ایک زمانہ تھا کہ سائنس کے دئے ہوئے فیصلوں کو حرف آخر مان لیا جاتا تھا۔ آج خود سائنس کے ذریعے ان لوگوں کی لائی ہوئی بربادیوں کی بنا پر سائنس اور اس کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگائے جا رہے ہیں۔

ہمارے ہاں انیسویں صدی کے وسط سے جو تبدیلیاں ہونا شروع ہوئیں انھوں نے ان لوگوں کو بھی نئے سوالات اٹھانے پر مجبور کیا جو اپنے کندھوں پر روایت کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ ان میں سب سے اہم مرزا غالب ہیں جن کے ہاں ایک سچے دانشور کا ذہن نمایاں ہے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی سے
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہی سنگ گراں اور

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا

سبز و گل کہاں سے آتے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اردو شاعری میں اس طرح کے اور بھی مقامات آئے ہیں جہاں شاعر اپنے اردگرد جب نظر ڈالتی ہے تو سوالوں کا ایک ہجوم اس کے دل و ماغ پر یلغار کر دیتا ہے۔

غالب کے بعد سرسید، ابوالکلام آزاد اور پھر اقبال کے ہاں دانشوری ہمیں اپنی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچتی ہوئی ملتی ہے۔

روز حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر
فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا میرا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

غرض کہ دانشوری کی کوئی منزل آخری منزل نہیں، خود اقبال کے الفاظ میں

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اردو میں دانشوری کی روایت

(پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ غلام السیدین)

ہمارے ہاں آزادی کی جدوجہد کے زیرِ اثر ظہور میں آنے والے دانش وروں کے کئی گروہ رہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قومی، بااثر مقبول گروہ وہ تھا جو سیاسی فکر و عمل میں گاندھی اور نہرو، مذہبی فکر میں ابوالکلام آزاد اور اقبال، ادب اور آرٹ میں غالب، اقبال اور ٹیگور اور زندگی کے مجموعی رویے میں جوان سب شعبوں کو اپنے دائرے میں لیے ہوئے تھا۔ مغرب کے لبرل ازم سے گہرے طور پر متاثر رہا ہے۔ اردو میں اس کے اہم نمایندے پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین اور خواجہ غلام السیدین تھے۔ تصورِ آزادی کے سائے میں پلنے والی دانش وری کی اس روایت سے بجا طور پر یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ آزادی کے بعد ابھرنے والی دانش وری کی روایت بھی اس کے زیرِ اثر فروغ پائے۔

ان تینوں دانش وروں میں انفرادیت اور امتیازی صفات کے باوجود بہت کچھ مشترک تھا۔ یہ لوگ خوش حال مشرقی گھرانوں میں تربیت پانے کے بعد تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ گئے۔ اور وہاں جدید افکار و تحریکات سے متاثر ہوئے۔ انیسویں صدی کے پڑھے لکھے اور حساس لوگوں کے برخلاف جنھوں نے مغرب کو بس دور سے دیکھا تھا اور جنھیں جدید مغربی ذہن و زندگی سے محض کتابوں اور اخباروں کی بدولت یا صرف ہندوستان آنے والے انگریزوں کے ذریعے صاحب سلامت ہوئی تھی، انکے ہاں مغرب سے مرعوبیت کا رجحان نہیں ملتا۔ کیونکہ انھوں نے وہاں کی زندگی کو بہت قریب سے، ان لوگوں کے درمیان خود رہ کر دیکھا تھا اور مغرب کے روشن

خیال مفکروں سے استفادہ بھی کیا تھا۔ عابد صاحب اور مجیب صاحب نے مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی رہنمائی میں عملاً بھی خود کو جہد آزادی کے ایک تعلیمی محاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس اسکیم میں وقتی سیاست کی حیثیت اگر چہ ثانوی تھی مگر اس کا ظہور گہرے سیاسی شعور کی بنا پر ہوا تھا۔ چنانچہ تعلیم کے ذریعے سماج پر اثر انداز ہونے کا مقصد انہیں وقتی سیاسی اتار چڑھاؤ سے دور رکھتے ہوئے بھی مجموعی تحریک کے نصب العین سے وابستہ رکھتا تھا۔ جامعہ جیسا ادارہ اس طرزِ فکر کی علامت تھا۔ اور لوگوں کے انفرادی مزاج اور نقطہ ہائے نظر کو تسکین بہم پہنچاتا تھا، جو بہ یک وقت باغیانہ بھی تھا اور تعمیری بھی۔ باغیانہ اس لیے کہ وہ نو آبادیاتی نظامِ زندگی اور سامراج کو بھی اکھاڑ پھینکنا چاہتا تھا اور فرسودہ جامد و بے جان مشرقیت سے بھی منحرف تھا اور تعمیری اس لیے کہ وہ اپنے معاشرے کی تعمیر نئے خطوط پر کرنے کا خواہش مند تھا جس میں مشرقی تہذیب کی اعلا صفات جدید عالمگیر تہذیب کے اعلا تقاضوں سے متصادم نہ ہوں، ہم آہنگ ہوں۔ جامعہ گویا ایک ایسا ادارہ تھا جو ان لوگوں کی دانش ورانہ شخصیت کی توسیع بھی تھا۔ سید ین صاحب اگر چہ مستقل طور پر اس طرح کے کسی ادارے سے وابستہ نہیں رہے مگر وہ فکری و جذباتی طور پر اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس راہ میں ایک شخصیت جوان ہی میں سے تھی، انکی مرشد بن کر اٹھی یعنی ڈاکٹر ذاکر حسین، جو محض دانش ور ہی نہیں بلکہ ان سب میں وہ تنظیم منصوبہ سازی اور رابطۂ عامہ کی سب سے زیادہ صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ ان لوگوں کو انگریزی زبان پر عبور تھا جس میں انھوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری بھی رکھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اردو میں اپنے افکار کی اشاعت کو زیادہ اہمیت دی، کیونکہ اس کے ذریعے وہ اپنا پیغام ملک کے وسیع حلقوں تک پہنچا سکتے تھے۔ انھوں نے ادب میں ڈرامے اور افسانے کی اصناف کو آزمایا مگر ان میں انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ شاید اس لیے کہ اعلا سماجی مقاصد وسیع علمی مطالعے اور دوسری متنوع دلچسپیوں کے فروغ کے ساتھ نشوونما پانے والے مزاج کا تقاضا تھا کہ وہ مضمون نگاری essay کی صنف کو اپنائیں۔ انھیں آرٹ، تہذیب، سیاست، فلسفہ، تاریخ، غرض کہ ہر شے سے دلچسپی تھی گو کہ ان سب کے مخصوص مطالعے کے میدان الگ الگ تھے۔ اور ان مخصوص مطالعوں کے اثرات ان میں سے ہر ایک کی تحریروں میں نمایاں ہیں۔

تمام دانش وروں کی طرح ان لوگوں کے طرزِ فکر میں بھی دو پہلوؤں کی باہم کشاکش ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ ایک تو وہ دنیا جو اپنے اردگرد دیکھتے ہیں اور دوسری وہ جس کا خاکہ ان کے ذہنوں میں ہے اور جسے اپنی نظروں سے دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں۔

مجیب صاحب، عابد صاحب اور سیدین صاحب کے نزدیک کائنات کی اہم ترین اکائی فرد کی ذات ہے۔ سماج، مذہب، سیاست، علم و ادب غرض کہ سب کا مقصد فرد کی مکمل خودمختاری ہونا چاہئے کہ اس کے بغیر سماج کی تعمیر ممکن نہیں۔ چنانچہ وہ مذہب بھی جو فرد کی آزادی کو رسموں، تفسیروں، تعبیروں اور علماء و فقہا کے متعین کیے ہوئے حدوں میں اسیر کردے خود اپنے مقصد کی شکست کا سبب بن جاتا ہے۔ مذہب ہر شخص سے آزادانہ فکری و عملی جدوجہد کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان دانشوروں کے خیال کے مطابق ہندوستانی مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان کی روحانی قوت کو مذہب کے نام پر ہی پسپا کردیا گیا۔ چنانچہ ان کی وہ تخلیقیت بھی سمٹ سکڑ کر ختم ہوگئی جو دنیوی فروغ کی بھی محرک ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ مادی و روحانی توازن بھی نہیں رہا جو اسلام کا مقصد تھا۔ یہ لوگ آزادی کے بعد کے ہندوستان میں ایسے معاشرے کی تمنا کرتے ہیں جہاں سارے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ مسلمان بھی اسلام کی اس روح کی بازیافت کرسکیں۔ جہاں مذہب ہو، مذہب پرستی نہ ہو! ان لوگوں کے نظامِ فکر مذہب حق پرستی اور انسان دوستی کی علامت ہے جب کہ مذہب پرستی، فرقہ پروری اور بردارکشی کی طرف لے جاتی ہے۔

فرد کا یہ تصور انھیں اپنے عہد کے دوسرے اہم فلسفے مارکسزم سے الگ کردیتا ہے۔ وہ مارکسی اشتراکیت کو فرد کی آزادی کے منافی اور ہندوستان کی سرزمین کے لیے اجنبی سمجھتے ہیں۔ اپنے لبرل مزاج کی بنا پر وہ اسے صرف شبہ کا فائدہ benefit of doubt دینے پر تیار ہیں اور وہ بھی اس لیے کہ جواہر لال نہرو کے تصورات میں اس کی آمیزش ہے۔ ان کے نظامِ فکر میں عناصر کے تصادم کی کوئی جگہ نہیں۔ وہ ان مفاہمت کے متلاشی ہیں اور یہی پہلو ان کے ہاں ہمیشہ حاوی رہتا ہے۔ نہرو اور گاندھی کے درمیان اختلافات کو مانتے ہوئے بھی وہ بالآخر دونوں کو ایک قرار دیتے ہیں۔ عابد صاحب کے نزدیک نہرو اور گاندھی کی راہیں آغاز اور انتہا میں تو ایک ہیں مگر درمیان میں الگ الگ رہتی ہیں۔ وہ درمیانی مرحلے میں بھی ان دو راہوں میں سے کسی ایک کے

بارے میں کوئی دوٹوک فیصلہ نہیں کرتے بلکہ دونوں کو یکساں آزمائش کا موقع دیتے ہیں۔ وہ ٹیگور اور گاندھی کے درمیان اختلافات پاتے ہیں اور پھر بھی اس طرح مفاہمت کر لیتے ہیں۔

''ہم اگر اپنے ملک سے نوع انسانی سے اور سچائی سے محبت رکھتے ہیں تو ہمیں ٹیگور کے ساتھ خواب دیکھنا اور گاندھی کے ساتھ ایک خواب کو اپنے عمل سے سچا کرنا ہے۔''

ان حضرات کے نزدیک اہنسا، انسانی جدوجہد کا صحیح طریقہ ہے۔ بدی کا وجود دنیا میں اس لیے نہیں کہ کچھ لوگ نیکی کے مقابلے میں بدی کو ترجیح دیتے ہیں۔ بلکہ وہ نیکی کی اس ناکامی کی بنا پر ہے کہ وہ بدی کے گوشوں تک پہنچ نہ سکی۔ اندھیرا روشنی کے مدھم ہونے کی وجہ سے نہ کہ خود اپنے بل بوتے پر۔ چنانچہ معاشرے کو بہتر بنانے کے لیے ہر فرد کو خود اپنی اصلاح کا آزادانہ موقع ملنا چاہیے۔ فرد کی اسی اہمیت کی بنا پر یہ بھی لازم ہے کہ کسی ایک لمحۂ حاضر میں کچھ افراد بہتر اور کچھ کمتر ہوں۔ چنانچہ گاندھی جی ان بہتر لوگوں میں تھے جو ہندوستان کو اس کی برائیوں سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ ملک کی تقسیم، فرقہ واریت، معاشی ابتری، عالمی بحران وغیرہ کا سبب یہ ہے کہ ملک کے افراد خود کو گاندھی جی کی خواہشات کے مطابق ڈھال نہ سکے۔ یہی حال نہرو کی کوششوں کا بھی ہوا جو گاندھی جی کے جانشین تھے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آزادی کے بعد یہ انداز فکر پھیل نہ سکا۔ اس کی جگہ بائیں بازو کا نقطۂ نظر زیادہ مقبول ہوا۔ اگرچہ وہ کسی ایک سیاسی متبادل کو جنم نہ دے سکا۔ بائیں بازو کے علاوہ مختلف مذہبی گروہوں کی تحریکات بھی پھیلنے لگیں۔ جنھوں نے مفاہمت کی جگہ فاصلہ پیدا کیا اور تصادم کو جنم دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے بارے میں مجیب صاحب، عابد صاحب اور سیدین صاحب کی تحریریں ہی آزادی کے بعد ظہور میں آئیں۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اس دور میں مذہب کا جو رول اپنے معاشرے میں دیکھا وہ ان کے تصورات کے مثالی ہندوستان سے بالکل مختلف تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایک ایسے نظام کی تمنا کی جو ہر نقطۂ خیال اور ہر مذہب کے لیے اس وجہ سے قابل قبول ہو کہ وہاں فرد کی مکمل خودمختاری کا احترام ہو سکے۔

ان لوگوں نے اردو دانش وری کی روایت کو جس بلند اور پرشکوہ منزل تک پہنچایا وہاں تک ان کے بعد اب تک کوئی پہنچ نہ سکا۔ ان کی شخصیت کا حُسن، علوم وفنون کا شغف اور وسعتِ نظر کی

جھلک ان کے اسالیب میں کارفرما ہے۔ ان لوگوں کے ہاں شدت کسی قسم کی نہیں۔ نہ فکر کی نہ اظہار کی۔ محاکے اور استدلال جا بجا، مگر واعظانہ اور خطیبانہ نہیں۔ ایک نرم، شائستہ فضا ہے جو پھیلتی چلی جاتی ہے۔ یہ انداز دلکش بھی ہے اور سنجیدہ و توانا بھی۔ ان کی نگارشات پر ان میں سے ہر ایک کی انفرادیت کا نقش بھی گہرا ہے۔ مجیب صاحب کا مزاج آرٹسٹ کا ہے۔ تاریخ کے ساتھ ساتھ شاعری، موسیقی اور مصوری سے وہ ایک تخلیق کار کی دلچسپی رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں رنگینی، جذب، اور اکثر ایک تحیر انگیزی کی کیفیت ملتی ہے۔ وہ اپنے خیال اور اظہار دونوں سے بار بار چونکاتے ہیں۔ وہ ذہنی اور جذباتی طور پر غالب سے زیادہ قریب ہیں جب کہ عابد صاحب اور سیدین صاحب پر اقبال کا گہرا اثر ہے۔ عابد صاحب کے ہاں مفکرانہ انداز ہے مگر ان کا سادہ، رواں اور واضح انداز ثقیل سے ثقیل موضوع کو بھی پانی کر دیتا ہے۔ ان کی حسِ مزاح بھی ان کے اسلوب کو اوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ سیدین صاحب کی دلچسپی تعلیم سے زیادہ ہے۔ وہ اس کے حدود سے نکلتے ہیں۔ ان کے ہاں ہمیشہ ایک معلم کا لہجہ نمایاں رہتا ہے۔ مجیب صاحب کے ہاں تشبیہ، استعارہ اور خیال آرائی کے سارے اہتمام ہیں جو عابد صاحب کے ہاں نسبتاً کم اور سیدین صاحب کے ہاں اور بھی کم ہیں۔ ان سب لوگوں نے جن مسائل پر لکھا ان میں ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ ان کی تحریریں ادب کی پھیلی ہوئی لامحدود فضاؤں میں آنے کی بجائے خصوصی مطالعے کے شیدائیوں کی جھولی میں گر کر غائب نہ ہو جائیں۔ مگر انھوں نے ایسا کبھی ہونے نہیں دیا۔ ان کی نگارشات میں مجرد تصورات ہوں، یا تفصیلی مباحث اپنے ادبی حسن کی بدولت کشش رکھتے ہیں۔ تاریخ، فلسفہ، ادب، تعلیم، مذہب وغیرہ پر ان کے مضامین ادبی انبساط بھی عطا کرتے ہیں اور فکر و تخیل کو مہمیز بھی۔

آزادی کے بعد اردو کے حلقوں سے کوئی ایسی شخصیت نہیں ابھری جو ان لوگوں کی روایت کو فروغ دے سکے۔ جب کہ دوسری زبانوں میں یہ صورتِ حال نہیں۔ دوسری جنگِ عظیم اور پھر آزادی کے بعد ساری دنیا میں مارکسی اور مذہبی فکر کے الگ الگ حلقہ ہائے اثر بڑھے ہیں۔ ان ہی کے اندر مختلف ذیلی مکتب خیال بھی وجود میں آئے ہیں اور انسان دوستی کا تصور بھی گاندھیائی نظریے میں محدود نہیں بلکہ دوسرے نظریات کے ذریعے پھیلتا رہا ہے۔ مارکسزم اور مذاہب زندگی

کے سارے شعبوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اشتراکی ممالک میں مارکسی نظریے کی عملی صورت کی پیدا کی ہوئی بیزاریوں، اور مشرق ومغرب میں مختلف مذہبی گروہوں کی تیز تر ہوتی ہوئی سرگرمیوں، جدید تکنالوجی کے جنم دیے ہوئے مسئلوں، کرۂ ارض پر ماحولیاتی توازن کو پھر سے قائم کرنے کی کوششوں، سماجی اور انفرادی زندگی سے متعلق نئی نئی واقفیتوں نے فکر وتخیل کے لیے بالکل نئی راہیں کھول دی ہیں۔ چنانچہ بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے کہ کچھ اور لوگ انسانی زندگی کے وسیع تر میدانوں میں اپنے فکر واظہار کو اس طرح آزمائیں گے کہ ان کی تحریریں مخصوص علمی خانوں میں اسیر ہونے کی بجائے وسیع دانش ورانہ روایات کا حصہ بن سکیں۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کے ذریعے علوم کا زبردست فروغ ہوا ہے۔ ہندوستان میں اردو کی مجموعی صورتِ حال کو دیکھ کر ایسی بڑی امیدیں باندھنا دیوانے کا خواب تو ضرور لگتا ہے، مگر اردو اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں ایسے مضامین بھی نظر آتے ہیں جو فکر واظہار کے ان نئے امکانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اگر بہت سے دروازے بند ہوئے ہیں تو کچھ نئے دروازے کھلتے بھی نظر آرہے ہیں۔

دانش وری کسی قسم کی بھی ہو، لازم ہے کہ وہ سماج، حکومت اور تسلیم شدہ روایات سے غیر مشروط معاملہ نہ کرے بلکہ اپنے عہد میں پلنے والی بے چینیوں کا جرأت مندانہ اظہار اس حد تک اور اس طرح کرے کہ اسے نظر انداز نہ کیا جاسکے۔ دنیا کا کاروبار خواہ وہ کسی کے ہاتھ میں کیوں نہ ہو آج تک پورا نہ ہوا اور نہ کبھی ہوسکتا ہے۔ صرف تکمیل کی طرف بڑھتا ہے اور اس راہ میں بے شمار تضادات کو جنم دیتا ہے۔ دانش وری ان ہی کے درمیان پلتی اور پنپتی ہے۔ چنانچہ ہر عہد کی دانش وری کی آبرو کسی نہ کسی رواج سے ٹکرانے میں ہے۔ ایک بہتر نظام کی تمنا اسے مروجہ نظام سے ساز باز نہیں کرنے دیتی۔ اس کا یہ ٹکراؤ ہی اس کی فکر کی صلابت کو عیاں اور مستقبل کی راہوں کو روشن کرتا ہے۔ ہمیشہ اثبات میں سر ہلانا conformism دانش مندی کا تقاضا تو ہوسکتا ہے مگر دانش وری کا نہیں کہ اس کا جوہر انکار non-conformism کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ سارے اچھے دانشوروں کی طرح یہ روایت اردو میں مجیب صاحب، عابد صاحب او سیدین صاحب کی تحریروں میں ہمیں ملتی ہے۔

سرور صاحب۔ایک دانشور

دانشور کے تصور کو (جو Intellectual کا ترجمہ) ہمارے یہاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ جمہوریت کے زیر اثر نشو ونما پانے والے نظام زندگی میں عقلیت اور آزاد خیالی کی اہمیت کا احساس ہی اس کی بنیاد ہے۔ مانی ہوئی باتوں اور رویوں پر سوالیہ نشان لگانا، گردو پیش کے حالات کو اور بہتر بنانے کی تمنا کرنا، ایک ذہنی اور جذباتی نا آسودگی کی بدولت ان جہتوں کی جستجو کرنا جہاں زندگی کچھ زیادہ بامعنی اور انسان کچھ زیادہ سربلند نظر آئے یہ وہ محرکات ہیں جو ایک ایسے اندازِ فکر کو پروان چڑھاتے ہیں جس میں انحراف اور تقلید و اطاعت سے عمومی گریز کی لے کچھ زیادہ نمایاں ہوئی ہے۔ ہرگز ضروری نہیں کہ دانشور ہمیشہ سب کے خلاف تلوار کھینچے کھڑا رہے۔ مگر وہ زندگی کے منفی پہلوؤں کو، خصوصاً خود اپنے عہد کی بدنمائیوں کو عیاں کرنے کا آئینہ ضرور ہوتا ہے۔ کسی ایک شخص کو متحرک کرنے والا کوئی ایک فلسفہ، نظریہ یا علم تو ہوسکتا ہے مگر وہ کئی سرچشموں سے سیراب ہوتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص عملی میدان میں زیادہ تر مصروف رہنے کے باوجود وسیع افق رکھتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو سے دلچسپی رکھتا ہے۔ سرور صاحب کے خیال کے مطابق:

''دانشوری جاننے اور عقل سے کام لینے کی صلاحیت کا نام ہے مگر جذبات اور تخیل کا اس میں دخل نہیں ہونا چاہیے۔ معلومات بہم پہنچانا اور ترجمانی کرنا بھی اس کے دائرے میں آتا ہے۔ اسے افکار اور نظریات سے قدرتی طور پر زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔'' (عابد حسین خطبات ص ۴۵)

ان کا یہ کہنا ہے کہ:

''حقیقی دانشور اپنے طبقے سے کٹ جاتا ہے کیونکہ وہ اس طبقے اور سماج کی

خامیاں دیکھ سکتا ہے۔ وہ اپنا فریضہ تنقید کے ذریعے پورا کرسکتا ہے۔ یہ تنقید پوری تہذیب پر ہوگی۔ (ص۲۰۰، مسرت سے بصیرت تک)

گذشتہ صدی میں جہد آزادی کے فروغ کے ساتھ بیداری کی ایک لہر ہمارے ہاں زندگی کے ہر شعبے پر چھا گئی۔ فلسفہ مذہب، سیاست معیشت شعروادب، علوم وفنون غرض کہ ہر طرف ایک نئی دھڑکن سنائی دینے لگی۔ سوشلزم، گاندھی واد، مختلف مذاہب کی اصلاحی تحریکات پر مبنی رویوں کے درمیان مکالموں نے پورے منظر نامے میں ایک ہماہمی پیدا کردی، جس سے جستجو کی نئی راہیں روشن ہوئیں۔ مغرب سے بڑھتی ہوئی آشنائی کے نتیجے میں لبرل نقطۂ نظر عام ہونے لگا۔ وہ حالات جنھوں نے سرسید کے طرز فکر کو جنم دیا تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں بالکل بدل گئے اور اب مغرب سے مرعوبیت یا خوف کے بجائے نوآبادیاتی نظام کے خلاف احتجاجی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ نئے تعلیم یافتہ طبقے میں شبلی اور اقبال جیسے لوگوں کا اثر بڑھنے لگا، مغرب سے استفادے کا شوق اور حوصلہ تو بڑھا مگر وہ رعب اور خوف کم ہونے لگا جو ۱۸۵۷ء کے بعد عرصے تک جاری رہا تھا۔ علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او کالج کے بطن سے جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے ادارے کا وجود میں آنا اس نئے رجحان کی نشان دہی کرتا ہے۔ مغربی علوم وافکار کو ہندستانی زبانوں کے ذریعے ملک میں پھیلانے کا جو سلسلہ انیسویں صدی میں قدیم دلّی کالج سے شروع ہوا اور علی گڑھ تحریک کے ذریعہ مقبول ہوا تھا اب اور بڑھنے لگا اس کے اثر سے اردو زبان کا دامن وسیع ہوا۔ ادب اور صحافت میں مضامین، مقالات اور انشائیوں کے ذریعے نئے دانشوروں نے سنجیدہ علمی نثر کو فروغ دیا، انگریزی زبان اور تراجم کے ذریعے عالمی علوم وادب کی طرف توجہ ہونے لگی۔ شبلی کے عہد کے بعد جن لوگوں نے لبرل نقطۂ نظر کو اپنایا اور اردو میں خاص طور سے اضافہ کیا ان میں ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر ذاکر حسین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے مغرب میں تعلیم پائی اور پھر اپنے ملک واپس آکر قومی مسائل میں علمی طور پر بھی سرگرم دلچسپی لی اور عملی طور پر بھی انھوں نے مغرب ومشرق کے طرز حیات اور فلسفے کے کسی ایک پہلو سے تعصب یا غلو کی بجائے ایک متوازن طرز فکر کی اشاعت کی۔ سرور صاحب کی ذہنی نشوونما میں بھی علی گڑھ کا وہ دور اہم ہے جب سرسید کے اثرات کے باوجود ایک منحرف بلکہ باغیانہ رویے کے لیے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ گاندھی واد سے لے کر مارکسزم تک ہر رنگ کے دانشور علی گڑھ اور

اس کے باہر سرگرم تھے۔ سرور صاحب کے علی گڑھ سے باہر جانے اور پھر واپس آنے کے درمیان کا زمانہ ملک کی زندگی میں بھی نہایت اہم ہے۔ ان کے ذہن وفکر کی تشکیل میں بھی، اردو ادب میں ان کے اثرات کے فروغ کا بھی یہی زمانہ ہے۔ آزادی کی تحریک محض ایک ہنگامہ آرا جدوجہد نہیں تھی۔ اس کے جلو میں فکرو دانش کے مختلف رجحانات کو بھی فروغ ہو رہا تھا، گاندھی، نہرو، آزاد، اقبال، ٹیگور اور دوسرے بہت سے لوگ نظریاتی اعتبار سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی جب مسائل کو ایک بڑے خاکے میں دیکھتے تھے تو کسی نہ کسی نقطہ پر باہم قریب ہی نظر آتے تھے۔ یہی زمانہ مارکسزم اور سوشلسٹ نقطۂ نظر کی مقبولیت کا تھا جس کے زیر اثر ترقی پسند تحریک نمودار ہوئی تھی۔ سرور صاحب ان سب سمتوں سے آنے والی ہواؤں میں سانس لے رہے تھے۔ چنانچہ ان کے نقطۂ نظر پر اس پوری فضا کا گہرا اثر نمایاں ہے مگر انھوں نے نظریات کی کسی انتہائی صورت کو کبھی قبول نہیں کیا۔ اسی وجہ سے ان کے اسلوب میں نہ قطعیت وادعائیت ہے نہ بلند آہنگی اور گھن گرج۔ اس سے ان کی شخصیت کے اس پہلو کا پتہ چلتا ہے جو مختلف اور متضاد عناصر میں بھی مفاہمت کا متلاشی رہتا ہے۔ سرور صاحب اردو کے ان چند مصنّفین میں ہیں جو اپنے مطالعے اور تحریروں میں ادب اور تنقید کو ترجیحی حیثیت دینے کے ساتھ ساتھ دنیا کے دوسرے مسائل کے بارے میں بھی فکرمند ہیں وہ ادب میں اقدار کی بات کرتے ہیں تو ان کی نظر ایک وسیع افق پر رہتی ہے۔ ان کا کہنا ہے:

''فکروفن کی آزادی میرے نزدیک سب سے بڑی قدر ہے۔ یہ آزادی مکمل آزادی نہیں ہے بلکہ رائج، مقبول، وقتی اور محدود وفاداریوں سے آزادی ہے تاکہ فن کار اور ادیب زندگی کے تجربات کو نئے معنی دے سکے۔'' (پہچان اور پرکھ، ص ۱۲)

وہ یہ بھی کہتے ہیں:

''ادب میں ذہنی آزادی عدم مطابقت بلکہ احتجاج کی قدر کی اہمیت ہے کیونکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ آج کے باغی کل کی روشنی کے معمار ثابت ہوئے ہیں ہر احتجاج اور عدم مطابقت میں کسی دوسری تنظیم وتعمیر کی طرف اشارہ ملتا ہے۔'' (پہچان اور پرکھ۔ ص ۱۶)

''ادب جب کسی مخصوص سماجی حد بندی یا آئیڈیالوجی (Ideology) کے

خلاف بغاوت کرتا ہے تو کسی اور بڑی سماجی وفاداری کی بنا پر۔'' (پہچان اور پرکھ)

سرور صاحب ترقی پسند تحریک سے نہ صرف ابتداء سے ہی وابستہ تھے بلکہ انھوں نے لکھنؤ میں اس کی تنظیم اور اپنی تحریروں کے ذریعے اس کے مقاصد کی اشاعت اور فروغ میں بہت اہم حصہ لیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں تنقید کو ایک خودمختار فن کے طور پر فروغ ہوا اس کے سب سے اہم لوگوں میں سرور صاحب ہیں۔ اس لیے ترقی پسند تحریک اور اردو تنقید میں ان کی تاریخی اہمیت ہے، مگر وہ ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں بھی اس کے یک رخے پن پر اعتراض کرتے رہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''رجائیت پرستی پر ان کا ایمان، تاریخ کے بہاؤ پر ان کا اصرار اپنی جگہ قابل قدر ہے مگر اس میں آدمی کی حقیقت کا خانہ کم ہے سماجی انسان سے محبت زیادہ۔''

(پہچان اور پرکھ۔ ص ۷۶)

سرور صاحب نے جدیدیت کا استقبال کیا اور اس کی ''دوسرے رنگوں کے میل سے چھٹکارا پانے کی کوشش'' اور ''موزوں و متناسب فارم کی بجائے معنی خیز فارم کی تلاش'' بدصورتی سے بھی حسن اخذ کرنے کی جمالیات کو سراہا۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا:

''یہ بہکتی بھی ہے اور بھٹکتی بھی ہے۔ کبھی کبھی چیخ اور ہذیان بھی بن جاتی ہے۔ کبھی خودکشی کی دعوت معلوم ہوتی ہے کبھی جنس کا اشتہار کبھی یہ پورے آدمی کے دریافت کی سعی ہے اور اس سعی میں بڑے امکانات پوشیدہ ہیں۔''

اپنے عہد کے ادبی منظر نامے کو انھوں نے بہت ہی جامعیت کے ساتھ ایک فقرے میں سمیٹ دیا ہے۔

''بیسویں صدی کی تیسری دہائی نے ہمارے ہاں رومانی انسان کو فروغ دیا، چوتھی دہائی نے باغی کو پانچویں نے مجاہد کو اور چھٹی دہائی کی موجودہ نسل سیاست سے بے تعلق ہوتی جارہی ہے۔'' (پہچان اور پرکھ، ص ۲۲۸)

سرور صاحب کی کتاب ''تنقید کیا ہے۔'' شاید اپنے عہد کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب تھی۔ ان کے اسلوب کی سادگی، دلکشی اور روانی میں دقیق نکات بھی سہل ہوجاتے ہیں۔ وہ نرم دھیمی آواز میں اپنی بات پورے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں۔ جارحانہ انداز میں اپنی بات نافذ

نہیں کرتے بلکہ مخالف کی رائے کا احترام کرتے ہوئے پڑھنے والوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔آج کل کے بہت سے نقادوں کی پتھرائی ہوئی جناتی، جارگن زدہ زبان میں یہ ظاہر نہیں کرتے کہ جس نے ان کی بات نہیں مانی وہ جاہل ہے، جہنم میں جائے، ان کی تحریروں سے مغربی ادب کے گہرے مطالعے کا بھی اندازہ ہوتا ہے مگر محض حوالوں اور مصنفین کے ناموں کی موسلا دھار بارش سے نہیں بلکہ ہر مضمون کی پوری ساخت ان کے تجزیاتی ذہن کے رد و قبول کی صلاحیت کا پتہ دیتی ہے۔

سرور صاحب کو ان سوالات سے بھی گہری دلچسپی ہے جو عصر حاضر کی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں۔چنانچہ تاریخ، تہذیب، معیشت اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔قوم کیا ہے سیکولرزم سے کیا مراد ہے۔ ہندستان کے کثیر الجہات (pluralistic) سماج میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کی کیا حیثیت ہونی چاہیے۔ ماضی سے ہمارا رشتہ کیا ہے۔اس طرح کے سوالات پر سرور صاحب کے خیالات مختلف تحریروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔مگر خصوصی طور پر انھوں نے محمد مجیب یادگاری خطبے ''محمد مجیب اور ہندوستانی مسلمان'' اور عابد حسین یادگاری خطبے ''اردو میں دانشوری'' اور ''خواب باقی ہیں'' کے آخری حصے میں قدرے تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ہمارے ہاں بہت سی اصطلاحات کا مفہوم مبہم رہا ہے خصوصاً وہ الفاظ جو انگریزی سے یا تو ترجمہ کیے گئے یا مستعار لیے گئے۔جتنی کثرت کے ساتھ ہمارے یہاں استعمال ہوئے مفاہیم کے لحاظ سے اتنے ہی منتشر بھی ہوتے چلے گئے اور ہماری ضرورتوں، مصلحتوں، اصطلاحوں کی پیچیدگی کی بنا پر تحلیل ہو کر انھوں نے بالکل نئی صورت اختیار کر لی۔مگر یہ مبہم تصورات بھی کسی نہ کسی رویے کی نمایندگی کرتے ہیں اس لیے ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس عہد کے سب ہی لوگوں کی طرح سرور صاحب کی یہ مجبوری ہے کہ ان سب کو ان کے ابہام کے ساتھ قبول کریں۔ہر چند کہ انھوں نے اپنے خیالات کی وضاحت کے ذریعے اس ابہام کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

قوم کا تصور Nation کا ترجمہ ہے۔سر سید نے قوم کے ساتھ نیشن کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور سرور صاحب نے بھی لکھا ہے کہ ہمیں اردو میں نیشن کا لفظ ہی اپنا لینا چاہیے مگر اس کے باوجود ان کی تحریروں میں قوم اور قومیت جیسی اصطلاحات ملتی ہیں۔ یہ سوال کہ ہندستان ایک قوم

ہے یا نہیں ہمیشہ معرض بحث میں رہا ہے۔ جہد آزادی کے دوران قوم پرستی کا چرچا ہوا اور ہندستان کو ایک قوم تسلیم کرنا بہت سے لوگوں کے نزدیک ایک مقدس فریضہ سمجھا جانے لگا۔ اس دور میں دو قومی نظریہ سامنے آیا تو قوم پرستوں اور دو قومی نظریہ والوں میں ٹھن گئی۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد خود جناح صاحب نے پاکستان کو بلا تفریق مذہب وملت ایک قوم قرار دیا اور پھر بنگلہ دیش کی بنیاد پڑی تب بھی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ہندستان میں تو اور پیچیدہ ہو گیا۔ ایک طرف علاقائی شناخت پر اصرار ہوا دوسری طرف کلچرل نیشنل ازم کا نعرہ لگایا گیا جس کی وجہ سے اور بھی نئے مسائل پیدا ہونے لگے ہیں۔ قوم سے متعلق سرور صاحب زبان سے اتفاق کرتے ہوئے عزیز احمد کے حوالے سے ان کا قول نقل کرتے ہیں۔

''آدمی نہ نسل کا غلام ہے نہ زبان کا، مذہب کا نہ دریاؤں کے بہاؤ کا، نہ پہاڑوں کی سمت کا لوگوں کا ایک بڑا جمگھٹ جس کی روح صحت مند اور دل گرم ہو ایک اخلاقی ضمیر پیدا کرتا ہے جسے قومیت کہتے ہیں۔ (پہچان اور پرکھ)

مگر اس شاعرانہ اقتباس سے جو شخص جو مفہوم چاہے نکال سکتا ہے اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہندستان میں ایک بڑا جمگھٹ ہے مگر اس کی روح صحت مند اور دل گرم ہے جس کا کوئی اخلاقی ضمیر ہے بس ایک نیک خواہش ہی ہو سکتی ہے مگر اس کے بعد سرور صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے:

''ہم ہندوستانی ایک قوم ہیں گو بعض مخصوص حالات کی وجہ سے قومیت کا یہ احساس عام نہیں ہوگا۔''

ان کا خیال بھی بالکل درست ہے کہ:

''ہمارا قومی احساس بعض تاریخی حالات کی وجہ سے اپنے ماضی کے تصورات سے آزاد نہیں ہو سکا ہے، اور چونکہ قومیت کا جذبہ نیا ہے اور بعض دوسرے جذبے پرانے اور صدیوں کے احساس اور فکر کے پروردہ ہیں اس لیے قومیت کا احساس ان دونوں کے سامنے ماند پڑ جاتا ہے۔''

(محمد مجیب اور ہندوستانی مسلمان)

موجودہ صورت حال کے بارے میں ان کا کہنا ہے:

"قومیت کے محدود، جارحانہ اور احیائی تصور کو فروغ دے کر ہمارے سیاست دانوں نے اس شاخ کو ہی ضرب لگادی جس پہ آشیانہ تھا۔"

(پہچان اور پرکھ، ص ۳۲)

سرور صاحب جمہوریت اور فرد کی آزادی کے قائل ہیں۔ ادب ہو یا سیاست وہ آزادی اظہار کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں اور موجودہ صورت حال کا سبب وہ جمہوریت کو نہیں بلکہ اس طبقے کے مفادات کو قرار دیتے ہیں جن کے ہاتھوں میں جمہوریت کی باگ ڈور ہے۔ سرور صاحب کے الفاظ میں "ان لوگوں کا تمام تر رویہ مصلحت پر مبنی ہے معرفت پر نہیں۔ سیکولرزم کا تصور بھی جو ہمارے ہاں مغرب سے درآمد ہوا جو اصلاً مذہب سے کسی قسم کی وابستگی سے بری تھا۔ ہمارے آئین میں جب یہ تصور قبول کیا گیا تو شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ ریاست کا نظام کسی بھی مذہب سے وابستہ نہ ہو مگر دورخے پن (Hypocrasy) کا جو ہماری سیاسی تہذیب کی نمایاں صفت ہے۔ یہ کرشمہ ہے کہ اسے سارے مذاہب کا برابر احترام قرار دے کر اس کے سایے میں مختلف مذہبی رسوم کو state policy کے طور پر عملاً تسلیم کرلیا گیا اور اکثر کی رسوم کو قدرتی طور پر غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی۔ سرور صاحب سیکولرزم کے مغربی تصور کی جگہ ہندستان کی صورت حال میں اس تصور کو مناسب سمجھتے ہیں جس کے مطابق ریاست کی نظر میں سب مذاہب کا برابر احترام اہو مگر اب سیکولرزم کا عملی روپ بھی ان کی توجہ کا مستحق ہے۔ سیکولرزم سے انحراف کے ساتھ ساتھ اس سے یکسر انکار کرنے والوں نے psueso secularism کی اصطلاح بھی وضع کرلی جو ہندتو کی ضمنی شاخ ہے۔ اسلام اور ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں سرور صاحب، سرسید، آزاد اور اقبال کے افکار سے آزادانہ استفادہ کرتے ہیں۔ وہ کسی ایک کے مرید ہونے کی بجائے، بہتوں کے درمیان ایک رشتہ دیکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسلام کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے حالات کی تبدیلیوں کے مطابق تعبیرات اور اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ وہ عابد حسین صاحب کی اس رائے سے متفق ہیں گذشتہ چند صدیوں میں مسلمانوں کی تخلیقی فکر ماند پڑگئی۔ علماء نے ابتدائی دور کے Dynamism کی جگہ تقلید کی راہ اختیار کی، اس انجماد نے ہر میدان میں انھیں نہ صرف سب سے پیچھے کردیا بلکہ جہاں مقابلے یا تصادم کی نوبت آئی وہ شکست پر شکست کھاتے چلے گئے ان کا یہ خیال توجہ طلب ہے کہ "ہم علماء کے کٹر پن کا بجا طور پر ماتم کررہے ہیں لیکن ہمارے جدید تعلیم

یافتہ طبقے میں جونئی کٹھ ملائیت آگئی ہے اس کا احساس کیوں نہیں، ان کے پاس علم کی روشنی ہے ہنرمندی نہیں، مقابلے کے قابل نہیں تحفظات کی بیساکھی مانگتے ہیں۔ ہندو اکثریت ہم پر آسیب کی طرح سوار ہے۔'' سرور صاحب مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے حق میں نہیں کیونکہ ان کے سب مسائل دوسرے فرقوں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہاں انھوں نے مولانا آزاد سے اختلاف کا اظہار کیا ہے جنھوں نے آزادی کے بعد سب مسلمانوں کو کانگریس میں آنے کا مشورہ دیا تھا۔ مجموعی طور پر سرور صاحب ایک درمیانی راہ پر چلتے ہیں، وہ کسی شے فرد یا حالت کو بالکل سیاہ یا بالکل سفید قرار دینے کے قائل نہیں بلکہ ہر جگہ مثبت و منفی پہلوؤں کے وجود پر اصرار کرتے ہیں۔ اردو کے دانشوروں سے ان کو خاص شکایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

'' ہندوستانی دانش وری عموماً اور اردو میں دانشوری خصوصاً تقلیدی رہی ہے اور کمزور بھی اس میں اتنی جرأت نہیں کہ پرانے سرچشموں سے فیض حاصل کرسکے، یہ مغرب سے اجالا مانگتی رہی اور وہاں جب اُجالے کے ساتھ تاریکی بھی بٹنے لگی تو اس نے اس کو بھی مہمان عزیز سمجھ کر دل و دماغ میں جگہ دی۔ اسے ہندوستانی بھی ہونا ہے اور عالمی بھی اور جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا سوال ہے اسلامی بھی۔''
(عابد حسین یادگاری خطبات، ص ۸۱)

دانشوری کی اس مختصر بحث کو ختم کرتے وقت مجھے اقبال کا یہ قطعہ یاد آتا ہے۔

منم کہ طوف حرم کردہ ام بتے بہ کنار
منم کہ پیش بتاں نعرہ ہائے ہوزدہ ام
دلم ہنوز تقاضائے جستجو دارد
قدم بہ جادۂ باریک ترزموزدہ ام

اس راہ پر چلنے کی کوشش کرنا ہی دراصل سچی دانشوری ہے۔

تہذیب کے علاقائی روپ اور اردو ناول

یوں تو ادب کی ہر صنف میں کسی نہ کسی تہذیب کے رنگارنگ عکس دیکھے جا سکتے ہیں مگر ناول کا پھیلا ہوا دامن اپنے اندر جتنے جلوے سمیٹ لیتا ہے، اس کا امکان کسی اور صنف میں نہیں۔ پھر ایک ایسی زبان کے ناول جو ملک کے کسی ایک خطے میں محدود نہ ہو بلکہ ہر علاقے میں پہنچ کر وہیں کی ہو رہی ہو اور پھر آزادانہ طور پر پھیلنے پھولنے لگی ہو، اس کی وسعتوں کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اردو کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علاقے میں قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ ملک کے دوسرے خطوں میں کچھ اس طرح اپنالی گئی کہ وہاں کے رہنے والوں کی نگارشات میں ان کی سرزمینوں کی دلکشی سماتی چلی گئی۔ اردو ناول میں علاقائی تہذیبوں کی جلوہ گری دیکھیے تو ان کی روشنیوں کی چشمک سے عجیب وغریب سماں نظر آئے گا۔

ناول کے ابتدائی دور میں نذیر احمد کی دہلی اور سرشار و رسوا کے لکھنؤ کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ملیں گی۔ پھر یہی ناول پریم چندر کے ساتھ بھرے پُرے جگمگاتے بارونق شہروں سے دور دیہاتوں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں، کرشن چند کے ساتھ کشمیر کے مرغزاروں، بمبئی کی چالوں، راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ پنجاب کے کھیتوں کھلیانوں کے درمیان لہلہاتا ہوا ملے گا اور قرۃ العین حیدر کے ہاں تو بیک وقت کئی خطوں کی تہذیبوں کا حسن آمیز ہوتا نظر آئے گا۔ اس طرح اردو ناول گذشتہ ایک صدی کے اندر خصوصاً آج کے دور میں تہذیب کی مختلف سطحوں، پرتوں اور جہتوں کے راز افشا کر کے نہ صرف ہمیں مسرت وانبساط عطا کرتا رہا ہے بلکہ ہمارے ادراک واحساس پر بھی اثر انداز ہوتا رہا ہے۔

جب ہم علاقائی تہذیب کی آئینہ داری کا ذکر کرتے ہیں تو لازماً ہمارا ذہن پہلے اُن علاقائی

خصوصیات کی طرف جاتا ہے جو کسی خطے کے بسنے والوں کو انفرادیت بخش کر انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ خصوصیات مقامات و مناظر کے علاوہ کرداروں کے واسطے سے بھی اُجاگر ہوتی ہیں۔ کرداروں کی زبان، ان کے باہمی ناتے رشتے، مجلسی آداب اور رکھ رکھاؤ، تعصبات و توہمات اور عقائد، دوسرے علاقوں کے لوگوں سے تعلقات، سب مل کر ایسی فضا کا پتا دیتے ہیں جس کے پیچھے صدیوں کا تاریخی ورثہ ہے۔ چنانچہ ناول کا کینوس بالعموم اور اردو کا دامن بالخصوص، ہمارے ناول نگاروں کی بدولت وسیع ہوتا رہا ہے۔

ہر علاقے کی تہذیب کے بھی کئی روپ ہوتے ہیں، ایک ہی سرزمین پر بسنے والے امیر اور خوش حال طبقے کی زندگی متوسط اور مفلوک الحال لوگوں سے مختلف ہوتی ہے۔ پھر شہروں، دیہاتوں اور مختلف سماجی گروہوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ہی سرزمین سے تعلق رکھتے ہوئے بھی کئی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اب دہلی کو ہی لے لیں۔ یہاں پُرانے شرفا کے گھرانوں میں جائیں تو رکھ رکھاؤ، برتاؤ محاورہ، لہجہ اور ہوگا۔ کرخنداروں کا انداز کچھ اور۔ یہی تہذیب جب ایک اکائی کی صورت میں کسی ادب پارے میں جلوہ گر ہوگی تو اس کا انحصار بہت کچھ ناول نگار کے اپنے مذاق و مزاج پر ہوگا کہ وہ کس قسم کی کہانی کہنا چاہتا ہے۔ اردو ناول میں مختلف علاقوں کی تہذیب بھی اسی طرح مختلف صورتوں میں نمودار ہوئی ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجیے۔ ایک شریف زادے جائے رہائش کی تلاش میں ہیں اور مرزا رسوا انھیں ایک مکان دکھانے لے جاتے ہیں۔

> ''واقعی مکان قابل رہنے کے تھا۔ زنانہ مکان پختہ، دو منزلیں، باہر بیٹھنے کا مکان جسے قصباتی زبان میں بیٹھکا کہتے ہیں۔ نہایت ہی معقول اور اس کے سامنے بڑا سا احاطہ۔ اس میں ایک طرف کھپریلیں تھیں۔ گاڑی گھوڑے اور سائیس، خدمت گار وغیرہ کے رہنے کے لیے جابجا کچھ درخت مختلف قسم کے لگے ہوئے تھے مگر بہت ہی بے تکے پن سے، کچھ بیلا چنبیلی کے جھنڈ، کچھ مہندی کی روشیں، بانس کا پھاٹک لگا تھا، غرض کہ مکان مرزا صاحب کو پسند آیا......''

اب اسی علاقے کا وہ مکان جہاں تک پریم چند چوگان ہستی میں پہنچتے ہیں:

> ''سامنے ایک نیم کا درخت، دروازے پر کواڑوں کی جگہ بانس کی پٹیوں کی

ایک ٹٹی لگی ہوئی تھی ۔ نہ کھاٹ، نہ بستر، نہ برتن ۔ ایک گوشے میں مٹی کا گھڑا تھا، جس کی عمر کا کچھ اندازہ اس پر جمی ہوئی کائی سے ہوسکتا تھا۔ چولھے کے پاس ہانڈی تھی۔ پرانا اور سوراخوں سے چھلنی بنا ہوا ایک لوہے کا توا اور ایک لوٹا۔''

اب ان منظروں سے بھی گزر جایئے اور ذرا نذیر احمد کی دلّی کے ایک گھر کے اندر 'توبۃ النصوح' کے دریچے سے جھانکتی کچھ لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی ہیں۔ ذکر بزرگوں کی ڈانٹ کا ہے۔ صالحہ کہتی ہے:

''استانی کی مار تو گنتی نہیں۔ امّاں جان نے بھی مجھ کو کوئی بیسوں دفعہ مارا ہوگا۔''

نعیمہ پوچھتی ہے: ''اب بڑے ہونے پر؟''

صالحہ: ''اب میں کوئی بات ہی نہیں کرتی کہ ان کے خلافِ مزاج ہو۔''

نعیمہ: ''میں نے بھی تو یہ سمجھ کر نہیں کہا تھا کہ اماں جان کو اتنا بُرا لگے گا۔ نہ کبھی امّی جان کو نماز روزے کا اتنا خیال ہوا جیسا کہ اب ہے۔''

صالحہ: ''لیکن تم کو خالہ جان کئی مرتبہ روک چکی تھیں، تو تم کو ان کی ممانعت کے خلاف پھر وہی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔''

نعیمہ: 'کیوں جی! خدا کو میری بات بُری لگتی تو جو کچھ ہونا تھا اسی وقت نہ ہو چکتا۔''

صالحہ: ''پہلے تو یہ بتاؤ، بات بے جا اور بُری تھی یا نہیں؟''

نعیمہ: ''خیر! بُری میں ہی سہی!!

دہلی کے گھرانوں میں بڑے چھوٹے کے درمیان ادب کے حدود، ماں بیٹی کے درمیان روایتی فاصلہ فرماں برداری اور نافرمانی کے تصورات، ماں کی ڈانٹ پڑنے پر بیٹی کا ردعمل اور دونوں لڑکیوں کی گفتگو سے گھر کے اندر کے ایک خاص ڈسپلن کا اظہار غرض کہ صدیوں کی بنی بنائی دہلوی تہذیب کی ایک جھلک ہے جو یہاں نظر آئی۔ مگر اب اسی ہندوستانی تہذیب کا ایک اور روپ دیکھنے کے لیے شہر دہلی کی فصیل سے دور نکل کر پنجاب کے سرسبز و شاداب کھیتوں کے درمیان پلنے والی زندگی کی طرف چلیے۔ راجندر سنگھ بیدی کے ناول ''ایک چادر میلی سی'' میں کچھ عورتیں یوں باتیں کرتی ہیں:

''تلّو کی بیوی اور اس کی پڑوسن چنو ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں، چنو نے اپنی کوکے والی

ناک پر انگلی دھری، پھر ایک لمبی سانس بھری اور بولی۔

''ہا! مَرد کی ذات۔ سب ایک ہی سی ہوتی ہے۔'' رانو کی غلافی آنکھیں پھڑ پھڑا رہی تھیں جیسے کوئی کپڑے کو دھو بنا کر چھانٹ رہا ہو۔ پھر کچھ سنبھلی مگر آنکھیں پونچھتے ہوئے رانو نے چنو کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

''اے! تیرا ڈبو تو ایسا نہیں۔''

اس پر چنو نے رانو کو ایک مردوں والی گالی دی جس سے وہ خود ہی شرما کر اپنے گھر کی طرف بھاگ گئی۔ رانو بھی اندر پہنچ کر کام کاج میں جا لگی۔''

مگر یہ تو اس رنگارنگی کی ایک جھلک ہے جس کا ذکر چند بڑے ناول نگاروں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں آج کے ناول میں اس سے کہیں زیادہ وسعتیں ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے ہر خطے کی سرزمین کی بو باس ہمارے ناول کے قصوں، کرداروں، مکالموں اور منظروں میں بسی ہے۔ داستانوں کی خواب زمینوں میں جنم لینے والی کہانی، دہلی کی اندرون فصیل حویلیوں اور لکھنؤ کی محل سراؤں سے ہوتی ہوئی یوپی اور پنجاب کے دور دراز دیہاتوں اور بمبئی کی چالوں تک پہنچی تھی۔ اب کھوئے ہوئے قبائلی باشندوں، خانہ بدوشوں، معذوروں، مغربی تمدنوں میں اپنی جڑوں کی تلاش میں حیران و پریشان لوگوں کو اپنے سنگت میں لیے ہوئے تہذیب کے تازہ تر خطوں میں سفر کر رہی ہے، جس سے اردو میں ناول کے فروغ کے آیندہ امکانات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

ہماری ثقافت کے باہمی رشتے

کسی بھی ملک کی ثقافت اس کی سرزمین پر بسنے والوں کی صدیوں کی کمائی ہوتی ہے۔ ہر زمانہ اپنی ضرورتوں کے مطابق اپنی نسلوں کی محنت ومشقت کی بدولت آنے والے زمانے کے لئے ایک ورثہ چھوڑتا ہے۔عہد بہ عہد جمع ہوتے رہنے والی یہ دولت اپنی ایک الگ پہچان بناتی چلی جاتی ہے جس کی بنا پر ایک خطۂ زمین کے لوگ کسی دوسرے خطے کے باشندوں سے ممیز وممتاز ہوتے ہیں۔مگر اپنے امتیاز کے باوجود کوئی بھی ملک یا سماج دوسرے سے بالکل الگ تھلگ نہیں ہوسکتا۔ تہذیبی لین دین کی بدولت سب ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھتے ہیں اور اپنے نئے نئے تجربات کی بنا پر آنے والے زمانے کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔

زماں ومکاں اپنی حد بندیوں کے باوجود ایک بڑھتے چڑھتے دھارے کی طرح نئی نئی بے شمار موجوں کو جنم دیتے ہیں۔ جو بسا اوقات بھنور بن جانے کے باوجود اس آگے چلنے والے دھارے کی موجوں کو فنا نہیں کرتے۔ نہ جانے کتنے چھوٹے بڑے دھارے اس بڑے دریا میں آکر گرتے ہیں۔ ہزارہا طوفاں بپا ہوئے ہیں۔مگر یہ سب مل کر اس کی قوت اور زور میں اضافہ کرتے جاتے ہیں۔اسے خشک نہیں ہونے دیتے۔

ہماری ثقافت بھی اس دھارے کی طرح ہے جو کبھی پرشور اور تلاطم خیز اور کبھی پرسکون دھیمی دھیمی لہروں کے ساتھ آگے بڑھتا رہا ہے۔ ہزاروں سال پرانی ثقافت کو پالنے والی یہ سرزمین یہاں کی جغرافیائی اور ماحولیاتی صفات کو اپنے اندر سموتے ہوئے تاریخ کے مختلف زمانوں میں

مختلف سمتوں سے آنے والی قوموں اور نسلوں کو پناہ دینے کے لئے اپنی چھتر چھایا کو پھیلائے ہوئے آج نہ جانے کتنے رنگوں میں جلوہ گر ہے۔ یہی رنگا رنگی اور روشنیوں کی یہی چمک ہے جسے آج ہم ہندوستان کہتے ہیں۔ ایک طرف ہمالہ اور دوسری طرف بحرِ ہند کی قدرتی حد بندیوں کے درمیان یہ زمین موسموں، منظروں، نسلوں، روایتوں، زمانوں اور مذہبوں کی ایک ایسی جلوہ گاہ ہے جس کی مثال دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں ملتی۔

عہد قدیم سے یہاں ہر سمت سے لوگ آتے رہے بستے رہے۔ آئے تو اجنبی تھے، بسے تو یہیں کے ہو رہے اور اپنے ساتھ جو کچھ بھی لائے وہ بھی یہیں کا ہو گیا۔ آج نظر دوڑائیے تو ایک ہی وقت میں کتنی زبانیں بولنے والے کتنی نسلوں کے لوگ کتنے قسم کے ریت رواج ہر علاقے میں ملیں گے۔ گویا ہندوستان کی خصوصیت یہی نہیں کہ یہاں متعدد علاقائی ثقافتیں بہ یک وقت ملتی ہیں بلکہ ہر علاقہ دوسرے علاقوں کی ثقافتوں کے لئے بھی اپنے دروازے کھولے ہوئے ہے۔ چنانچہ علاقائی شناختوں کے باوجود ہندوستان ایک وحدت کے طور پر بھی مضبوط ہوتا رہا ہے۔ ملک کے اندرونی ثقافتی رشتوں کے ساتھ ہی ساتھ باہر کی تہذیبوں نے بھی ہماری ثقافت سے باہمی رشتہ ہمیشہ استوار رکھے ہیں۔ آریوں کی آمد سے لے کر یورپی قوموں کے باشندوں کی آمد تک ہماری ثقافت نے کیا کچھ نہ قبول کیا۔ چنانچہ آج کی دنیا میں اس کا انوکھا پن یہی ہے کہ دوسروں سے بہت کچھ حاصل کر کے اسے کچھ اس طرح اپنا لیا گیا کہ اب اس کا رنگ روپ بھی ہماری ضرورتوں ہمارے مذاق و مزاج کے مطابق کچھ اس طرح بدلا کہ اب وہ ہندوستانی ثقافت سے ہی منسوب ہو گیا۔ آسانی کی غرض سے اس ثقافت کے اندر گھل مل جانے والے عناصر میں سے کچھ کو ہند ایرانی کہا جاتا ہے کچھ کو ہند یورپی اور اس کے سوا بھی نہ جانے کتنی اصطلاحیں سنائی دیتی ہیں۔ مگر اپنی اصل میں بالآخر یہ سب کچھ ہندوستانی ہی ٹھہرتا ہے کہ اب نہ تو انھیں اس شکل میں نہ ایران میں دیکھا جا سکتا ہے نہ یورپ میں اور نہ کہیں اور۔

سچ پوچھئے تو ہماری ثقافت کی بقا کا سبب بھی یہی ہے کہ ایک طرف تو اس نے اپنے دروازے دوسری ثقافتوں کے خوبصورت عناصر کے لئے ہمیشہ کھلے رکھے تو ساتھ ہی ساتھ اپنی اندرونی حرکت و قوت کے سہارے ان سب عناصر کو باہم تحلیل کر کے انہیں ایک نئی صورت ایک

نئے حسن سے بھی آراستہ کرتا رہا۔ اور آنے والے زمانوں میں بھی یہی صفات ہماری ثقافت کے فروغ کی ضمانت ہوں گی۔ آج جب کہ جدید رسل وسائل نے دنیا کے مختلف خطوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے تو ثقافتوں کے باہمی رشتوں کے مضبوط ہونے کے امکانات اور بھی بڑھ گئے ہیں۔ موسیقی کی محفلیں ہوں، ادبی جلسے ہوں، سائنس اور ٹکنالوجی سے متعلق اطلاعات ہوں۔ کھیل کے میدان کی رونقیں ہوں غرض کہ زندگی کا کون سا پہلو ہے جو پل بھر میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک نہیں پہنچ جاتا۔ عوامی ذرائع ترسیل نے تو یہاں تک انقلاب برپا کر دیا کہ آج معلومات اطلاعات اور خیالات سے واقف ہونے کے لئے بہت پڑھا لکھا ہونا بھی لازم نہیں رہا۔

ریڈیو اور ٹی وی نے تو نہ جانے کتنے ایسے خطوں کی زندگی کو دنیا پر روشن کر دیا جن کے وجود کے بارے میں کچھ عرصہ پہلے تک لوگوں کو پتہ بھی نہیں تھا۔ اور پھر خلا کے سفر نے تو نئے نئے سوالات اور ان کے ساتھ نئے نئے امکانات پیدا کر دیئے ہیں۔

آج جو ہمارے لئے ان دیکھا پراسرار اور سات پردوں میں چھپا ہوا ہے کل وہی ہماری روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہونے والا ہے۔ اب جب کہ ہم ۲۱ ویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں تو ذرا گزری ہوئی صدیوں پر بھی تو نظر ڈالیے ہم کہاں سے چلے تھے اور اب کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ کبھی ہم سے پہلے آنے والوں نے یہ کچھ دیکھا تھا؟ ہاں خواب وخیال کے سہارے وہ ان دیکھے مستقبل کی طرف ضرور سفر کرتے تھے جس کے نقش ہمارے قصوں کہاوتوں اور داستانوں میں ہماری لوک کتھاوں میں آج بھی پائے جاتے ہیں۔ خواب وخیال کی راہیں آج بھی بند نہیں۔ کل اگر ہم اُڑن کھٹولوں کے قصے گھڑتے تھے تو آج زہرہ ومریخ میں بستیاں بسانے کے منصوبے بنانے لگے ہیں۔ وہ من گھڑت باتیں سچی ثابت ہوئیں تو کیا عجب کہ آج کہ یہ ہوائی قلعے کل ہمارے قدموں میں ہوں۔ غرض کہ ثقافت ایک جیتی جاگتی ہر طرف سے سب کچھ اپنے اندر سمیٹتی ہوئی انسان کی اندرونی دبی ہوئی خواہشات کو عیاں کرنے والی اس کے خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے والی شے کا نام ہے۔

اور یہ کوئی ایسی شے نہیں جو کسی ایک نسل ایک نقطۂ نظر، ایک خطۂ زمین یا ایک زمانے میں

رہنے والوں کی خواہشوں کی پابند ہو۔ ثقافت پر کسی کا جبر نہیں چلتا۔ کتنے اشخاص کتنی تحریکات آئیں جنھوں نے ثقافت کا گلا اپنی تنگ دنیا میں لاکر گھونٹ دینا چاہا، کتنی جنگیں ہوئیں محض اس لئے کہ ایک ثقافت کو دوسروں پر لادا جا سکے۔ مگر یہ سب ناکام ہوئے کہ کسی ملک کی زندگی کسی سماج کا چلن کبھی کسی ایک گروہ کی جاگیر نہیں بن سکتا۔ اور نہ کوئی اتنی طاقت رکھتا ہے کہ تازہ ہواؤں کو آنے سے روک سکے۔ چنانچہ ہماری ثقافت بھی گذشتہ ہزاروں سال تک اسی کھلی فضا میں پروان چڑھی ہے۔ آج اگر نئے نئے آسیب نظر آتے ہیں جیسے کہ جدید تکنالوجی کی بدولت ماحول کی آلودگی یا انسانی معاشرے میں حیوانی صفات کے فروغ کے خطرات، یا مشینوں کی غلامی یا دولت اور مادی وسائل کی فراوانی سے بڑھنے والی حرص و ہوس جسے اصرافیت یا Consumerism کا نام دیا جاتا ہے۔ تو یہ سب کچھ خطرناک ہونے کے باوجود اپنا توڑ بھی خود اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اور یہ توڑ مضمر ہے ان خطرات سے بڑھتی ہوئی واقفیت میں جو آج انسان کو پہلے سے زیادہ ہے۔ آج کی تہذیب کے پیدا کیے ہوئے ان نئے آسیبوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ہی آج کے انساں کی طاقت اور ہماری ثقافت کے تحفظ اور فروغ کی ضمانت ہے۔

قصہ خواب زمینوں کا

''تو صاحبو! ذرا کان دھر کر سنو، لکھنے والے نے یوں لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں طے نامی یمن کا ایک بادشاہ تھا۔ نہایت صاحب حشم، عالیجاہ، فوج کی طرف سے فرخندہ حال، زر و جواہر سے مالا مال۔ اس کی رعیت ہیز دہ ہزار اور سپاہ بے شمار۔''

مگر ذرا ٹھہریے! آج دنیا تو اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑی ہے اور ہم قصہ لے کر بیٹھے ہیں اگلے زمانے کے بادشاہ کا۔ اس زمانے کے پڑھے لکھوں میں بیٹھ کر ایسی داستانیں سنانے سے فائدہ جہاں بس شہزادے شہزادیاں جن اور پریاں، جادوگر اور جادوگرنیاں ہوں اور ٹونے ٹوٹکے کرنے والے تو ہم پرست لوگوں کی باتیں ہوں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں؟

یہ بات بھی درست ہو سکتی ہے مگر راتوں کی نیند اچاٹ کر دینے والے یہ قصے الف لیلیٰ، طلسم ہوش رُبا، چار درویش کی داستان، قصہ حاتم طائی، یہ سب ایسے بے حقیقت نہیں ہیں اور اگر ان میں محض خرافات تھی تو یہ وجود میں کیوں آئے اور ہزاروں سال بیت جانے پر بھی آج اچھے کیوں لگتے ہیں، کیا ان میں بھی کوئی حقیقت چھپی ہوئی ہے؟

دراصل زندگی کی سچائیاں کتنی ہی بے درد اور جان لیوا ہوں، وہ خواب وخیال کی دنیا کو مسمار نہیں کر سکتیں بلکہ خواب وخیال کا عالم خود اتنی بڑی اور اتنی پرانی سچائی ہے کہ ہم آج تک اس کے سایے میں زندہ رہتے آئے ہیں۔ سوتے جاگتے اس دنیا سے دور خیالوں کی رنگین وادیوں میں کھو جانا انسان کی سرشت ہے۔ روزمرہ کے جھمیلوں کی یکسانیت سے تھک ہار کر وہ اکثر کوئی ایسا گوشہ تلاش کر لیتا ہے جہاں زمان و مکان کا کوئی قانون نہیں چل سکتا اور جہاں گھڑی بھر کے لیے ہی سہی وہ سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے جس کی اس نے اس دنیا میں تمنا کی مگر پا نہ سکا۔ یہاں پہنچ کر

وہ اپنی روح کی بے چینی، ذہن کے بوجھ اور جسم کی تکان غرض سب کچھ اتار پھینکتا ہے اور اس کے بعد پھر تازہ دم ہو کر دنیا کے کاروبار میں مصروف ہو جاتا ہے۔ زندگی جتنی تلخ اور سخت ہو خواب و خیال کی دنیا اتنی ہی حسین اور دلکش ہوتی ہے۔ انسان نے ہر عہد اور ہر منزل پر آنے والے بہتر زمانوں کے جلوؤں کی کرشمہ سازیاں اپنے تخیل کے آئینے میں دیکھی ہیں وہ ارتقاء کے کتنے ہی اعلا سے اعلا مراحل طے کر لے جائے مگر بلند تر اور حسین تر منزلوں کے خواب دیکھنے سے باز نہیں آسکتا۔ خواب و خیال کا یہی جہاں ہے جو ہمیں داستانوں میں ملتا ہے اور جسے انسان ازل سے تراشتا رہا ہے۔

جب وقت اور فاصلے پر ہمیں آج کی طرح قابو نہیں تھا، خود اسی سرزمین پر نہ جانے کتنے خطے اور مناظر ایسے تھے جو نظروں سے اوجھل تھے۔ نگاہیں افق تک پہنچنے کے بعد افق کے پار دیکھنے کی تمنا کو اور اسی کے ساتھ تجسس کی قوت کو اور بھڑکاتی تھیں۔ عرصۂ زندگی تنگ مگر خواہشوں اور ارمانوں کا سلسلہ دراز تر ہوتا جاتا تھا، فطرت کے جبر کو انسان نے اپنے تخیل کی قوت سے زیر کیا اور اسی تگ و دو میں اور بہت سی چیزوں کے ساتھ داستان طرازی بھی سیکھی۔ وہ جب زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر نہ کر سکتا تھا تو اس نے اڑن کھٹولے اور ہوا میں اڑنے والے قالین کے ذریعے چاروں کھونٹ ایک کر لیے۔ جب فطرت کی قوتوں کے آگے اس کی طاقت بہت کم تھی تو تخیل نے اسے وہ وسائل دیے جو فطرت کے بھی اختیار سے باہر تھے۔ جن، پریاں، جادوگر، اسم اعظم، انسانی بولی بولنے والے اور ان دیکھی دنیاؤں کی خبر لانے والے چرند و پرند اور ایسے انسان کہ جن کو دیکھ کر پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جائیں اور چڑھے ہوئے دریا راستہ دے دیں۔ خود فطرت اور کائنات کے جبر نے ہی دراصل انسان کو اس کے چھپے ہوئے بھید کھولنے پر ہمیشہ اکسایا ہے اور جب تک زمان و مکان کا یہ گورکھ دھندا باقی ہے ہمارا ذہن نئے نئے رازوں کو پانے کی کوشش میں ایسی ہی پُراسرار وادیوں سے ہو کر گزرتا رہے گا۔

ایک وقت وہ بھی تھا جب چاند اور ستارے محض ہمارے تخیل کی چادر میں ٹکے ہوئے تھے اور سائنس کی کمند وہاں تک نہ پہنچی تھی تب ان کے بارے میں بھی ہماری حیرت نے طرح طرح کی عجیب و غریب کہانیاں بنالی تھیں۔ آج انھیں سر کر لیا ہے تو ہوا میں اڑنا یا چاند تاروں کے رازوں کو سمجھنا کوئی خاص بات نہیں۔ یہی نہیں ٹکنالوجی کے اس دور میں ریڈیو، ٹی وی، ٹیلی پرنٹر وغیرہ وغیرہ

کے ذریعے ہم نے وقت اور فاصلے پر بڑی حد تک فتح پالی ہے تو کیا ہم نے ان سے آگے کی منزلوں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا؟ خلا کے اس پار کیا ہے؟ آنے والے زمانوں میں کیا ہونے والا ہے؟ موت کی تاریک وادی کے ادھر کیا ہے؟ یہ اور نہ جانے کتنے سوال آج بھی ذہن کو بے چین کرتے رہتے ہیں اور اسی بے چینی سے سکون پانے کے لیے خواب بنے جا رہے ہیں اور جب یہ ان دیکھی سرحدیں بھی پار کر لی جائیں گی تو ہم آگے کی طرف دیکھنے میں محو ہو جائیں گے اور آج کے خواب، کل عہدِ گذشتہ کی داستانوں کا حصہ بن جائیں گے جو اس وقت خواہ کتنے ہی بے حقیقت کیوں نہ ہو گئے ہوں ہمارے مادّی اور ذہنی سفر کی طے شدہ منزلوں کے نشان بن کر قصے کہانیوں میں زندہ رہیں گے۔

دنیا کی کوئی شے تغیر کے عمل سے بری نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ اچھے اور بُرے کا خوبصورتی کا اور بدصورتی کا تصور بھی بدلتا رہتا ہے مگر ایک قانون ایسا بھی ہے جو اٹل ہے۔ اچھے اور بُرے کا مفہوم خواہ کتنا ہی بدلتا رہے۔ ان دونوں میں ٹکراؤ لازم ہے اور ہماری پرانی داستانوں سے لے کر آج کے ناول اور افسانے تک ہیرو ہیروئن اور ویلن (Villan) کا تصور بھی اسی تجربے کی دین ہے۔ خیر ناول اور افسانے کا تو یہاں کیا ذکر؟ داستان کے کرداروں کو دیکھیے تو ہیرو ہمیشہ پُرشکوہ، حسین، دولت مند، بہادر، عالی نسب، شریف، نیک، ہمدرد، فیاض اور بدی کی قوتوں کے خلاف نبرد آزما نظر آئے گا اور نام بھی اس کا فیروز بخت، فرخ سیر وغیرہ، ہیروئن ہوگی تو پری پیکر، اس کا حُسن جہاں تاب اور ناز و انداز میں غارت گر جان و ایمان اور نام بھی مہر نگار، ماہ طلعت حسن بانو وغیرہ اور زر و جواہر میں تولی ہوئی، اور ویلن (Villan) کو دیکھیے تو ظالم، بھونڈا، بدہیئت، شریفوں کو ستانے والا اور ہر اچھے کام میں ٹانگ اڑانے کا ماہر، اور ان کے علاوہ بھی داستان کی فضا میں پلنے والے سارے کردار عجیب و غریب، سو فی صد نیک یا پورے طور پر بُرے، ہیرو کی جان کے پیچھے دنیا کی تمام طاقتیں پڑی ہیں، وہ دلیری کے ساتھ سب کا مقابلہ کرتا چلا جاتا ہے مگر بار بار وہ ایسے ایسے پھندوں میں پھنس جاتا ہے کہ نکلنا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا مثلاً کسی اندھے کنویں میں قید ہے جس کی نگرانی جن اور دیو کر رہے ہیں یا کسی جنگل بیابان میں کھو گیا ہے جہاں نہ آدم نا آدم زاد فقط خدا کی ذات، اب اچانک اسم اعظم کی بدولت کوئی غیبی قوت اسے بچانے کو آجاتی ہے اور آن کی آن میں سارے دشمن زیر ہو جاتے ہیں صحرا گلزار بن جاتا ہے۔ ذرا آج کے مقبول عام

ناولوں پر نظر ڈالیے۔ وہ جاسوسی ناول ہو، سائنٹفک فکشن ہوں یا space fantasy کے نام سے جانے جاتے ہوں۔ ہیرو سب کو شکست دیتا ہوا کسی ایسی منزل میں داخل ہو جاتا ہے۔ جہاں دشمن جال بچھائے بیٹھے ہیں۔ وہ پھنس جاتا ہے، جان کے لالے پڑ جاتے ہیں اور جب اسے نکال لاتے ہیں۔ پتا چلتا ہے کہ اس کے کپڑوں کے دھاگوں میں یا قمیص کے بٹن میں یا جوتے کے تلے میں کوئی ایسا جدید وضع کا آلہ چھپا ہوا تھا جس کی ایجاد کی خبر بھی دشمن کو نہیں تھی۔ چنانچہ ہیرو بدمعاشوں کے نرغے سے نکل آیا۔ یہ سب کچھ ہو جاتا ہے تو ہم اطمینان کی سانس لیتے ہیں، جیسے خود ہماری مصیبت ٹل گئی۔ یعنی ہماری یہ تمنا پوری ہوئی کہ خیر کی قوتیں جو دنیا اکثر شر کے بنائے حصار میں گھر جاتی ہیں شکست نہ کھا سکیں۔

یہ اور اس طرح کے نہ جانے کتنے جذبات ہیں جو بے حقیقت نہیں بلکہ اس زمین پر انسان کے وجود کے رازوں کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور ہمارے قصوں، کہانیوں اور داستانوں میں پیوست ہیں۔

ہمارا ادبی ورثہ: مثنوی گلزار نسیم

تاج الملوک جس دن سے اس دنیا میں آیا اسی دن سے اسے سات پردوں میں چھپا کر رکھا گیا۔ وہ زین الملوک بادشاہ مشرق کا پانچواں بیٹا تھا۔ بے حد حسین اور حوصلہ مند۔ مگر نجومیوں نے بتا دیا تھا کہ جس دن باپ نے اسے دیکھ لیا باپ کی آنکھیں جاتی رہیں گی۔ باپ سے چھپانے کے سارے جتن ہوئے مگر تقدیر میں تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔ وقت گزرتا گیا، تاج الملوک جوان ہو گیا۔ اور ایک دن جب زین الملوک اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شکار گاہ سے واپس آ رہا تھا بیٹے پر نظر پڑ گئی۔ اور بادشاہ اندھا ہو گیا۔ سب شہزادوں نے کمر باندھی کہ دنیا کے جس کونے سے بھی ملے کوئی ایسی دوا لائی جائے جس سے بادشاہ کی بینائی واپس آ جائے۔ تاج الملوک سب سے زیادہ ذہین، حسین اور باہمت تھا۔ اور اسی لئے بھائیوں کے حسد کا شکار بھی۔ اس نے جان جوکھم میں ڈال کر پتہ لگا لیا کہ پریوں کے دیس کی ایک شہزادی کے باغ میں ایک پھول ہے۔ گل بکاؤلی، اس کا حرزہ آنکھوں پر لگایا جائے تو آنکھوں کی روشنی واپس آ جاتی ہے۔ اب کیا تھا۔ تاج الملوک نکل کھڑا ہوا۔ جنگل، پہاڑ، ندیاں، جنوں کی بستیاں، جادوگروں کے ہتھ کنڈے دشمنوں کے نرغے غرض کہ کیا کچھ تھا جو تاج الملوک کو نہ دیکھنا پڑا۔ مگر وہ بھی بلا کا ہمت والا تھا۔ فاقے کئے گرفتار ہوا، بھیس بدل کر مارا مارا پھرا اور بالآخر نہ صرف گل بکاؤلی ہاتھ آیا۔ بلکہ پریوں کی شہزادی بھی ملی۔ بھائیوں کی سازش، راجہ اندر کی پریوں کی شہزادی سے ناراضگی اور نہ جانے کیا کچھ تھا جو راستے میں آیا مگر تاج الملوک سب کو زیر کر گیا۔

یہ تو ہوا پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کا قصہ۔ مگر قصہ تو بہت پرانا ہے اور گل بکاؤلی کی داستان کس نے نہ سنی ہوگی ۔ مگر نسیم نے کچھ اس انداز سے سنائی کہ اردو ادب میں ان کے نام سے ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گئی۔ مثنوی کی صنف بہت پرانی ہے اور اردو میں تو دکن کے شاعروں کی مثنویاں، میر، میر اثر، میر حسن کی مثنویاں شہرت و مقبولیت حاصل کر چکی تھیں۔ خصوصاً میر حسن کی مثنوی سحرالبیان تو اپنی خوبیوں کی بنا پر بے مثال ہے۔ ان سب کے بعد مثنوی گلزارِ نسیم ظہور میں آئی۔ 1836ء کے آس پاس جب لکھنؤ کی تہذیب اپنے عروج پر تھی، اور اس کے اثر سے پر

تکلف، آراستہ اور اس زمانے کے مانے ہوئے ادبی محاسن کے مطابق جو نظم ونثر کے شاہکار تخلیق ہور ہے تھے، وہ ماضی سے مختلف اور تخلیق کاروں کی صلاحیتوں اور حیثیتوں کے مطابق منفرد تھے۔ مثنوی گلزار نسیم بھی اسی عہد کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ بلکہ لکھنؤ کے سب سے زیادہ نمائندہ ادبی نمونوں میں مثنوی گلزار نسیم ہے۔ لفظی اور معنوی رعائتیں اور صنعتیں اردو کی شاید ہی کسی تخلیق میں اس کثرت سے پائی جاتی ہوں جتنی کہ اس مثنوی میں۔ آج کا پڑھنے والا ہر ہر مصرعے پر ٹھہرے گا اور اس کا ذہن لاتعداد مقامات پر لفظ ومعنی کے گورکھ دھندوں کو حل کرنے میں محو ہو جائے گا۔ تشبیہات و استعارات کے انوکھے پن پر ششدر رہ جائے گا۔

اردو میں طویل نظموں کی روایت کا جائزہ لیا جائے تو گلزار نسیم کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے ہاں غزل کی مقبولیت ہمیشہ طویل اور مسلسل نظموں کے آڑے آئی ہے۔ اس کے باوجود طویل نظموں کا ایک بڑا اور اچھا خاصا سرمایہ مثنویوں اور مرثیوں کی صورت میں سامنے آتا رہا ہے، یہ نظمیں جو اکثر دھیان سے اس لئے بھی اتر گئیں کہ غزل کی طرح یہ پوری کی پوری زبانی یاد نہیں کی جاسکتی تھیں۔ نہ ان کے اچھے اشعار اپنی کہانی سے الگ ہو کر غزل کے الگ الگ اشعار کی طرح کوئی تاثر پیش کر سکتے تھے اور نہ انھیں غزل کی طرح موسیقی کی سنگت نصیب ہوئی۔ مگر اپنے حدود میں رہنے کے باوجود ہمارے اس ادبی سرمائے کی اہمیت کم نہ ہوئی۔ بلکہ آج جب ادب کی پسندیدگی کے معیار بڑی حد تک بدل چکے ہیں، ان کی اہمیت کا احساس کچھ زیادہ ہی ہو رہا ہے۔ مثنوی گلزار نسیم بھی ہماری ان یادگار طویل نظموں میں سے ہے۔ پسندیدگی کے ادبی معیاروں کے بدل جانے کی بات آئی ہے تو یہ بھی کہہ دینا لازم ہے کہ ماضی کا بہت سا سرمایہ آج زبان و بیان کی اجنبیت کی بنا پر ہم سے دور جا پڑا ہے۔ ایسا بھی ذخیرہ ہے جس میں زبان کی دقتوں سے زیادہ سابقہ نہیں پڑتا۔ یا اگر پڑتا بھی ہے تو ہم اس کی دوسری خوبیوں کی وجہ سے ان دقتوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ مثنوی گلزار نسیم آج کے پڑھنے والوں کے معیاروں کے مطابق زیادہ تر مشکل اور اَدق ہے۔ مگر پھر بھی اس کے بہت سے حصے سادہ، دلکش، یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ مثلاً گل بکاؤلی کے غائب ہونے پر پریوں کی شہزادی کا واویلا تو اپنی مثال آپ ہے۔ اچھا ہے کہ اس قصے کے چند اشعار پر یہ گفتگو ختم ہو۔

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے
جس کف میں وہ گل ہو، داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو، گل چراغ ہو جائے
آباد صبا ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا

سلسلۂ روز و شب

اقبال نے کہا تھا:

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صرفیِ کائنات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

یہ نہ ختم ہونے والا سلسلۂ روز و شب اپنے تمام اسرار کے ساتھ ہمیشہ سوالیہ نشان بنا رہا ہے۔ سائنس دانوں کے مطالعہ کا موضوع بھی رہا۔ شاعروں کے تخیل کو آزماتا رہا۔ فلسفیوں کے قیاس کا مرکز رہا اور ہم سب ہی کے لیے اپنی زندگی کی کامرانیوں اور تحریروں کے حساب کا پیمانہ اور امیدوں کا محور رہا۔ مگر آج تک وہ کسی کی گرفت میں نہ آسکا۔ جس کی سمجھ میں یہ جتنا آیا اس نے اس کو غنیمت جانا۔

بہت عرصہ ہوا کسی نے کہا تھا کہ وقت کی صفت یہ ہے کہ وہ گزر جاتا ہے۔ غور کیجیے تو وقت کا گزرنا جتنا یقینی ہے اتنا ہی پراسرار بھی ہے۔ کبھی اس کی رفتار اتنی آہستہ ہوتی ہے کہ اس کے

گزرنے کا پتہ تک نہیں چلتا کبھی یوں ہوتا ہے جیسے پلک جھپکنے میں صدیاں گزر گئیں۔ اور ایسے وقت بھی آئے ہیں جب کوئی لمحہ بس ٹھہر گیا ہو۔ اب اس کے اندر اضافیت وغیرہ کی جو پیچیدگیاں ہیں انھیں تو کوئی آئن سٹائن ہی حل کرے۔ مگر داناؤں اور محققوں کے سارے فیصلے سن لینے کے بعد بھی ہمیں نہ تو وقت کی یہ ادا بدلتی ہوئی ملتی ہے اور نہ اس سے ہمارا رشتہ۔

ہم تو صبح وشام سے اپنی عمر کو ناپتے ہیں اور وقت کے گزرنے کا اندازہ لگاتے ہیں۔ گھڑیوں، کلنڈروں اور جنتریوں نے تو مسئلہ اور بھی سہل کر دیا ہے۔ مگر یہ تو بس کہنے کی بات ہے سورج کا نکلنا اور ڈوبنا، زمین کا اپنے محور پر گردش کرنا۔ موسموں کا بدلنا اور پھر قوموں اور افراد پر اچھا برا وقت آنا اور گزر جانا ظاہر کرتا ہے کہ ازل سے ایک رواں دواں دھارا ہے جو موج در موج بڑھتا چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس اتھاہ اور بے اور چھور دریا کا سرچشمہ کہاں ہے اور جاتا کہاں تک ہے۔ اس کا تو بس قیاس کرتے رہیے۔ معمے کا ایک حل ہوتا تو پھر کیا پریشانی تھی۔ اس کے تو ہزار جواب ہیں۔ جسے چاہے مان لیجیے۔

بہر حال ساری دنیا میں نیا سال تو وقت گزرنے کی دلیل کے طور پر منایا ہی جاتا ہے۔ اس بار تو ہم نے ساری دنیا کو اس خوشی میں ناچتے گاتے، جام چھلکاتے دیکھا کہ موجودہ کلنڈر کے دو ہزار سال پورے ہو رہے ہیں۔ اور وہ سارے سوالیہ نشان جو وقت گزرنے کے مسئلے پر لگائے جاتے رہے ہیں۔ اچانک ذہنوں سے محو ہو گئے۔ گزرے ہوئے برسوں اور صدیوں کا محاسبہ کیا گیا۔ آنے والے زمانوں سے امیدیں باندھی گئیں۔

آپ جس زاویے سے بھی چاہیں دیکھیں سب سے اہم صفت جو انسان نے حاصل کی وہ ہے وقت کا شعور۔ وقت کے شعور نے ہی وقت اور فاصلہ کے تعلق کو عیاں کیا۔ زمان و مکاں کے اس گورکھ دھندے کو سلجھانے میں وہ آج تک سرگرداں ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ مگر اس عمل میں اس کا شعور پختہ تر ہوا انسان کی انسانیت پر جلا ہوتی رہی۔ دو پیروں پر چلنے والی یہ زمینی مخلوق اشرف المخلوقات ہونے کا دعوا کرنے لگی۔ ہر چند کہ اس سماجی حیوان کی حیوانیت کم ہوتے ہوتے بھی اکثر بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔ عہد قدیم کی قبائلی جھڑپوں اور سلطنت سازوں کی جنگوں، نسلی برتری، طبقاتی اونچ نیچ، فرقہ وارانہ تفرقوں کی بدولت خود انسان نے کیسی کیسی قیامتیں انسانوں پر

توڑیں، انھیں یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ آج بھی کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں ہر روز ہم جبر وتشدد کا کوئی نہ کوئی مظاہرہ دیکھتے ہیں۔ مگر فنا کی آندھیوں میں بقا کے عناصر ہمیشہ مستقبل کا یقین دلاتے رہے۔

وقت کے شعور کے ساتھ اس تمام عرصے میں انسان نے خود کو پہچانا۔ اور یہ خود آشنائی اس کی سب سے بڑی دولت ثابت ہوئی۔ پہلے پہل جب اس نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو وہ فطرت کی قوتوں کے آگے مجبور محض تھا۔ ہوا، پانی، آگ سب ان کے لئے انجانے عناصر تھے۔ اس نے جب سخت موسموں میں سر چھپانا اپنے لئے غذا تلاش کرنا اور پھر فصلوں کو اگانا جانوروں کو پالنا سیکھا تو اپنی جسمانی قوت کا ادراک کیا پھر ہتھیار اور آلات سے اس کی دسترس بڑھی تو گویا اس کی قوت کے حدود کی توسیع ہوئی۔ پھر بھاپ اور بجلی سے لے کر زہرہ و مریخ پر کمندیں ڈالنے کے وسائل تک اسے حاصل ہوئے اور اس کے اختیارات کے حدود بڑھتے رہے۔ مشینی انسان یعنی Robort سے لے کر مصنوعی زندگی یعنی کلون clone تک کی تخلیق نے اور پھر جدید ترسیلی اور اطلاعاتی تکنالوجی نے امکانات کی وہ دنیا روشن کر دی جس کی وسعتوں اور پہنائیوں کا پورا اندازہ کرنا بھی اب ممکن نہیں۔ اسرار کی تہیں جیسے جیسے کھلیں گی، انسان کائنات کے اس بے کراں نظام میں اپنے آپ کو اور زیادہ پہچانتا رہے گا۔

خود آشنائی کا یہ نہ ختم ہونے والا عمل اگر قوت کے ادراک کا مرہون منت ہے تو اس کا یہ تقاضا بھی ہے کہ اپنی قوتوں کی توسیع کے ساتھ انھیں بے قابو بھی نہ ہونے دیں۔ اختیارات کے بڑھنے کے ساتھ غرور اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کی تباہ کاریاں بھی عیاں ہوتی رہتی ہیں۔ آج خشک ہوتے ہوئے دریا مرجھاتے ہوئے سبزہ زار، ناپید ہوتے ہوئے جنگل، کھسکتی ہوئی زمینیں اور ٹوٹتے ہوئے پہاڑ، صاف ستھری ہواؤں میں ہر لحظہ گھلتا ہوا زہر، شفاف دریاؤں کا گدلاتا ہوا پانی، پراسرار جسمانی اور نفسیاتی بیماریاں، سیلاب، طوفان، زلزلے، غرض کہ کیا کچھ نہیں ہے جو آج ہر لحظہ طعنہ زن ہوتا ہے۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہیں رکاب میں

بیسویں صدی تک ہم نے خود کو بے قابو ہوتے ہوئے بارہا دیکھا۔ مگر اس صدی کے

خاتمے تک یہ آگاہی بھی بڑھنے لگی کہ تعمیر و ترقی کے جلو میں چھپے ہوئے تخریب کے عناصر کی عناں گیری کے بغیر انسان کا اختیار اس دنیا پر مکمل نہیں ہو سکتا۔

آنے والے دن بھی گزری ہوئی صدیوں کی طرح جبر و اختیار کی اس کشمکش سے نبرد آزما ہوتے ہوئے انسان کے شعور اور خود آشنائی کی سطح کے بلند و پست کو متعین کریں گے۔ سلسلۂ روز و شب جاری رہے گا۔ سورج ہر صبح نکلے گا۔ ہر شام ڈوبے گا اور پھر نمودار ہوگا۔ آج جو کچھ پوشیدہ ہے کل عیاں ہوگا۔ اور نئی اور انجانی جہتوں میں بہت سے چھپے ہوئے راز اپنی طرف بلائیں گے۔ تبدیلیوں کی رفتار تیز تر ہوگی۔ جو آج نیا ہے کل پرانا ہو چکے گا۔ کائنات کے اس حیرت کدہ میں بار بار سوال آئے گا۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

پیہم رواں ہے زندگی

(سوانح نگاری کا فن)

میر نے کہا تھا اور کیا سچ کہا تھا

ہے آج جو سرگزشت میری   کل اس کی کہانیاں بنیں گی

اور یہ بات میر تک ہی نہیں بلکہ دنیا کے متعدد لوگوں پر صادق آتی ہے۔ بڑی بڑی شخصیتوں کی سوانح ہر زمانے میں لکھی جاتی رہی ہے۔ بلکہ شاید جب سے انسان کو اپنے وجود کا احساس ہوا ہے اس وقت سے اسے اس کا احساس بھی رہا ہے کہ دنیا میں ہر فرد اپنے اندر ادراک اور تجربات و مشاہدات کی ایک کائنات چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔ اسے افشا کرنا اپنے وجود اور اس کے انوکھے پن پر اصرار کرنا ہے بلکہ اپنے ہم عصروں اور اپنے آنے والوں کے لیے افکار وتجربات کا خزانہ بھی پیش کرنا ہے۔ چنانچہ اردو ادب میں بھی سوانح نگاری کی روایت بہت پرانی ہے۔ بزرگوں اور پیمبروں کی سیرت سے لے کر عالموں اور فن کاروں کے تذکروں تک سوانح کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہوتا گیا۔ سوانح کا فن اصول وضوابط کے کسی ایک چوکھٹے میں اسیر نہیں کیا جاسکتا۔ ہر سوانح نگار خود اپنے ضوابط بنالیتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے لکھتا چلا جاتا ہے۔ سوانح نظم میں بھی ہوسکتی ہے جیسے میر نے ایک مثنوی کی شکل میں لکھی، خطوط میں بھی لکھی جاسکتی ہے۔ جیسے کہ غالب کی سوانح، سوانح اخبارات رسائل اور یادداشتوں سے بھی ترتیب دی جاسکتی ہے اور کہاوتوں روایتوں کی بنا پر بھی کسی کی زندگی کی معلومات حاصل کر کے مرتب کی جاسکتی ہے۔ اردو ادب میں ان سب شکلوں میں سوانح نگاری پائی جاتی ہے اور ہر شکل میں اہم اور زندہ رہنے والی نگارشات

وجود میں آئی ہیں۔ ان سب کو سمیٹتے ہوئے سوانح نگاری کو دوسری شاخوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک تو خودنوشت سوانح عمری یا آپ بیتی اور دوسری وہ سوانح حیات جو مصنف کی اپنی نہ ہو بلکہ کسی اور شخص کی ہو، آپ بیتی اس اعتبار سے دلچسپ ہوتی ہے کہ اس میں مصنف خود اپنے تعلقات، لڑائی جھگڑوں، اپنے دوستوں اور دشمنوں، یاروں اور معشوقوں، اپنے سرپرستوں کے بارے میں بہت کچھ لکھتا ہے جس سے وہ جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے، اس کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس میں گفتنی، ناگفتنی سب کچھ ہوتا ہے۔ بہت ساری باتیں جو کوئی شخص خود نہیں کہہ سکتا یا جان بوجھ کر چھپا جاتا ہے وہ کسی اور سیاق وسباق میں خود اپنے تعلق سے کہہ جاتا ہے۔ چناں چہ بہت سی شخصیتوں کا جو روپ ہمیں دکھائی دیتا ہے وہ ان سوانح کو پڑھ کر بالکل بدل جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ جو بچپن تک روکھا پھیکا نظر آتا تھا اپنی حقیقی زندگی میں بڑا رنگین اور من چلا نکلے اور جس کی خودداری اور تمکنت کے چرچے رہے وہ سرکار دربار میں سر جھکائے ہوئے اور کوچۂ یار میں خوار ورسوا نکلے۔ پھر دنیا میں ہونے والے واقعات حکومتوں کا بننا بگڑنا جنگوں اور ہنگاموں کی روداد یں، مختلف اہم شخصیتوں کا عام زندگی میں رول، جشن وجلوس چھوٹے چھوٹے واقعات بڑے بڑے نتائج غرض کہ دنیا میں برپا ہونے والی ہر بات کے گہرے نقش ان آپ بیتیوں میں ملتے ہیں۔ آپ بیتی صرف بڑی شخصیتوں کی ہی نہیں ان لوگوں کی بھی اہم ہوتی ہے جو عام زندگی میں معمولی سمجھے جاتے تھے مگر جن کے دل ودماغ کی دینائیں شاداب تھیں، اور جنھوں نے دنیا سے آسان گزر جانے کی بجائے ہر ہر نقش کا حساب رکھا ہر لمحہ کے رس کو نچوڑا اور اسے اپنی ذات کے واسطے سے ناپا تولا اور پھر ہمارے لیے کسی نہ کسی شکل میں چھوڑ گئے۔ آپ بیتیوں کا ادبی صنف کے طور پر مقبول ہو جانے کے بعد آپ بیتی لکھنے والے بسا اوقات اپنے پیکر کو بہتر بنا کر پیش کرنے کی بھی خواہش کرنے لگے، چنانچہ دوسروں کے سامنے بے حجاب ہو جانے کے بجائے سیکڑوں حجابوں میں ایک حجاب آپ بیتی بھی بن گئی۔ اس لیے آپ بیتی پر ٹھیک ٹھیک بھروسا کر لینا بھی دانشمندی نہیں۔ بلکہ دراصل کسی عہد کے مختلف لوگوں اور خصوصاً ہم عصروں اور اگر دستیاب ہوں تو ہم جولیوں کی آپ بیتیاں ملکر ہی ایک سچی تصویر بنا سکتی ہیں۔ یہ آپ بیتی عام

سماجی ، سیاسی تاریخ کے بنیادی ماخذ ہیں ، یہ دراصل تاریخ کے کھوئے ، چھپے ہوئے یا چھپائے ہوئے اوراق ہوتے ہیں جنھیں ایک ایک کر کے جمع کرلیا جائے تو کسی عہد کی پوری تاریخ مرتب ہوسکتی ہے۔دوسروں کی سوانح حیات بھی بہت اہم ہیں۔زیادہ تر یہ سوانح بڑی بڑی شخصیتوں کے ہیں جنھوں نے زندگی کے کئی شعبہ میں نمایاں حیثیت حاصل کی اور اپنے عہد پر گہرا نقش چھوڑ گئے۔ان سوانح کے لکھنے والے لوگوں میں عموماً وہی لوگ ہوتے ہیں جو شخصیت سے بہت قریب یا بہت متاثر ہوں۔ایسی سوانح بھی لکھی گئی ہیں جن کا لکھنے والا محض ایک عقیدت مند ہے اور کسی بڑی شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے اور اس کی خوبیوں یا شخصیت کے دلکش پہلوؤں کو دوسروں سے متعارف کرانا چاہتا ہے۔اگر آپ بیتی لکھنا اس لیے مشکل ہے کہ لکھنے والے کی اپنی ذات اس کا مرکزی کردار ہے تو سوانح لکھنے والے کا کام اور بھی دشوار ہے۔اس لئے کہ ممدوح کی شخصیت کے بارے میں ساری معلومات حاصل کرنا ان جانے ان دیکھے گوشوں تک پہنچنا لوگوں خصوصاً عزیزوں اور مخالفوں کی رایوں کو چھان پھٹک کر کے دیکھنا اور ہر ہر بات کی تحقیق کرنا جان جوکھم کا کام ہے۔پھر سوانح نگار کا کام محض معلومات یکجا کر دینا ہی نہیں بلکہ معلومات کو اس طرح مرتب کرنا ہے کہ پڑھنے والے کی نظروں میں اس کی چلتی پھرتی تصویر گھومنے لگے۔ایسے لوگوں کی سوانح جنھوں نے دنیا کے فکری نظام یا سماجی ،سیاسی نظام کو یا علم کی دنیا کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور زیادہ مشکل ہے۔کیوں کہ ان کے کارناموں کی بنا پر ان سے عقیدت کرنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہوتی ہے اور عقیدت کی بنا پر بہت سی کہانیاں مشہور ہو جاتی ہیں۔بسا اوقات سچائی سے زیادہ عقیدت مندوں کی عقیدت اور محبت کا اظہار کرتی ہیں۔چناں چہ ایسے شخص کی سوانح پڑھنے کے بعد لوگ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ واقعی کیا وہ شخص ایسا تھا جیسا کہ کتاب میں نظر آتا ہے۔بنے بنائے بت خصوصاً وہ جن کے نقش نگار وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ حسین تر یا بدنما ہوتے رہے ہیں ان کی صورتوں کو بدلنا اور دلوں میں سچا نقش قائم کرنا مشکل تو ہے مگر سوانح نگاروں نے اکثر بنے بنائے بتوں کو توڑ بھی دیا ہے۔ایک اور مشکل وہاں آتی ہے جہاں سوانح نگار اور اس کے ممدوح میں مزاج اور نقطۂ نظر کی ہم آہنگی تو ہو مگر اس کے باوجود شخصیت کی اہمیت کا منکر بھی ہو یا اس سے شخصی قرب بھی رکھتا ہو۔کوئی شخص کتنا ہی محتاط کیوں نہ ہو سوانح لکھنے والا خود بھی بہر حال عام انسانوں

میں سے ہی ایک ہے۔ اس کا اپنا مزاج، اپنا نقطۂ نظر غرضیکہ خود اسکی اپنی شخصیت دوسرے کی سوانح میں نمایاں ہو کر آ جاتی ہے۔ اور اگر سوانح لکھنے والا خود کوئی بہت اہم شخص ہو تو سوانح اور زیادہ دلچسپی کا مرکز بن جاتی ہے۔ طباعت و اشاعت کی آسانیوں اور اپنے پر چار کے شوق نے سوانح نگاری میں کچھ تاجرانہ اور مقبولیت پیدا کرنے والا انداز بھی پیدا کر دیا ہے۔ واقعات جھوٹے سچے جیسے بھی ہوں دلچسپ اور بھڑ کا دینے والے ہوں یا بڑی شخصیتوں کی لغزشوں کا پتہ دیتے ہوں جن کا دیر تک لوگوں میں چر چار ہا یا کسی سے انتقام لینے کی خاطر اس کے برے پہلوؤں کو ہی اجاگر کر دیا جائے یا نمک مرچ لگا کر پیش کیا جائے سوانح نگاری میں مصنف کی انانیت کسی نہ کسی طور آتی ضرور ہے۔ دوسرے کی شخصیت کو خود اپنی کیفیت کے عیاں کرنے کا آئینہ بھی بنا دیتا ہے اور آپ بیتی لکھنے والے عموماً اپنی ذات کو اپنے چہرے اور ناک نقشے کو ہر لحظہ آئینہ میں دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ بہر حال سوانح ہمارے ادب کا بہت بڑا اور وقیع سرمایہ ہیں۔ اردو میں سوانح نگاری بطور ایک صنف کے انیسویں صدی میں ہی آئی۔ اور سب سے بڑے سوانح نگار حالی تھے۔ جن کی کتابیں 'یادگار غالب' 'حیات جاوید' اور 'حیات سعدی' آج سوانح نگاری کے کلاسکس ہیں۔ شبلی نے بھی سوانح نگار کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل کیا۔ انھوں نے اسلامی تاریخ کی اہم شخصیتوں کی طرف خاص توجہ دی۔ ان کا کارنامہ سیرۃ النبی ہے۔ اس زمانے میں سوانح نگاری بھی مقصدیت اور افادیت کی بنا پر مقبول ہوئی۔ حالی و شبلی اہم شخصیتوں کی خوبیوں کو اس لیے بیان کرتے تھے کہ لوگ ان سے سبق حاصل کریں اور افراد کی اصلاح ہو۔ چنانچہ ان حضرات نے بڑی شخصیتوں کی زندگی کے اچھے اور قابلِ تقلید پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ حالی، غالب کے بڑے معتقد تھے۔ حالی، غالب کی جن باتوں کو بُرا سمجھتے تھے ان کو پیش کرتے ہوئے بھی انھوں نے غالب کی شخصیت کی مجموعی دلآویزی کی ہی پیکر تراشی کی، اور اپنے مزاج کو راہ دینے کے باوجود اسے غالب کی شخصیت کے آڑے نہیں آنے دیا۔ اس عہد کے بعد متعدد سوانح نگار آئے۔ مولانا آزاد سے لے کر خواجہ غلام السیدین اور صالحہ عابد حسین تک جن کی سوانح کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس عہد کی اہم سوانح ہیں۔ خود نوشت سوانح عمریوں میں جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات'' نے خاصا ہنگامہ برپا کیا کیونکہ جوش نے اس میں ایک طرف بلا کم و کاست بعض جانے پہچانے لوگوں کے بارے میں اپنی رائے اور اپنے

تعلقات کا ذکر کر دیا۔ بعض جگہ اس کا بھی خیال آتا ہے کہ جوش نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ بہر حال جوش کی سوانح دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہے۔ عبدالماجد دریا بادی، رشید احمد صدیقی، صالحہ عابد حسین اہم سوانح نگار ہیں اور ان کی نگارشات ہمارے ادب میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ اس صنف کے فروخت کے امکانات ہمارے ہاں بہت زیادہ ہیں۔ ہاں کچھ تہذیبی مجبوریاں کچھ مانع بھی ہوسکتی ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں ابھی وہ جرأتمندی بلکہ بے حجابی جو مغرب کی سوانح عمریوں میں ملتی ہے نظر نہیں آتی۔ پھر بھی چند آپ بیتیاں ظاہر کرتی ہیں کہ اب ہمارے ہاں تکلفات کی دیواریں ٹوٹ رہی ہیں۔ ان میں خاص طور سے قابل ذکر ندا فاضلی کی ''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں کے باہر'' زبیر رضوی کی ''گردشِ پا'' اور وارث کرمانی کی ''گھومتی ندی'' ہے۔ ساقی فاروقی کی سوانح ''پاپ بیتی'' جو دو قسطوں میں شائع ہو رہی ہے وہ بھی دلچسپ ہے۔ امکانات اس بات کے ہیں کہ اور بھی دلچسپ سوانح عمریاں سامنے آئیں گی۔

احتشام حسین۔نئی دنیا کا مسافر

('ساحل اور سمندر' کے آئینے میں)

احتشام صاحب کا مرتبہ نقاد کی حیثیت سے سب مانتے ہیں۔ وہ اشتراکی نظریے کے قائل تھے۔ زندگی، ادب اور تنقید میں اُسے برتتے تھے۔ اُن کے نظریے کے مطابق معاشی نظام، سیاست، تہذیب، عقائد اور اُن میں زمانے کے تغیرات کے زیر اثر تبدیلیاں افراد اور گروہوں کے رویوں کو متعین کرتی ہیں۔ چنانچہ احتشام صاحب کے ذہنی رویے کو سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ ہم اپنے مطالعے کو صرف ان کے تنقیدی مضامین تک محدود نہ رکھیں بلکہ اُن کی ان تحریروں پر بھی غور کریں جن میں اپنے زمانے کی سیاست اور تہذیب کے بارے میں انھوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ اس اعتبار سے اُن کا سفر نامہ ایک معلومات آفریں اور دلچسپ کتاب ہے۔ سفر نامے یوں تو دلچسپ ہوتے ہیں مگر ایک ایسے دانشور کا سفر نامہ جو اپنے عہد کی فکری اور ادبی تحریک کے رہنماؤں میں ہے، مزید اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے ذریعے ان اثرات کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے جو خود سفر نامے کے مصنف پر وقتاً فوقتاً پڑے اور جو اس کی تحریروں کے واسطے سے اس حلقے میں بھی منتقل ہوئے جس کا وہ رہنما ہے۔

احتشام صاحب ستمبر ۱۹۵۲ء کے دوسرے ہفتے میں امریکا پہنچے تھے۔ گذشتہ پچاس برسوں میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اس تیز رفتار سفر کے نقش ان پچاس برسوں کے اندر ظہور میں آنے والی دستاویزات میں ثبت ہیں۔ احتشام صاحب جب امریکہ گئے اس وقت وہاں بہت کم لوگ جاتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد یورپی ممالک کے سامراجوں کے خاتمے کے ساتھ امریکہ کی سرداری کا دور شروع ہوا۔ اس سے قبل زیادہ تر لوگ تعلیم، تجارت یا سیاحت کے لیے یورپ جایا کرتے تھے۔ امریکہ میں آزادی سے قبل ایک سیاسی گروہ ضرور گیا تھا جو غدر پارٹی کے نام سے آج بھی جانا جاتا ہے۔ اس کا اخبار بھی نکلتا تھا مگر اس کا دائرہ بہت محدود تھا۔ عوامی اور

سرکاری سطح پر بھی امریکہ اور ہندوستان کا رابطہ بہت کم تھا۔ دراصل بیسویں صدی سے قبل امریکہ خود ہی اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھے ہوئے تھا۔ آج کی طرح رسل ورسائل بھی نہیں تھے۔ سفر بھی جان جوکھم کا تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں ہندوستان سے ایک ہاتھی تحفے کے طور پر امریکہ بھیجا گیا تھا۔ کلکتے میں جہاز پر وہ چلا تو بہت دن تک کچھ کھانے پینے سے انکار کرتا رہا۔ ایک دن جہاز پر اس کے سامنے سے کوئی شخص گزرا جس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ ہاتھی نے جھٹ وہ اخبار چھین کر چبا لیا جب وہ ہاتھی امریکہ پہنچا تو وہاں اس کی نمائش کا خاصا اہتمام کیا گیا اور دیکھنے والوں کو ہدایت کی گئی کہ کوئی اس کے سامنے اخبار نہ لے جائے ورنہ وہ حملہ کرے گا اور کھالے گا۔ یہ واقفیت کی سطح دو سو سال پہلے امریکہ میں ہندوستان کے جانوروں کے بارے میں تھی۔ انسانوں کے بارے میں تو شاید آج تک ناقص ہے۔ احتشام صاحب جب امریکہ پہنچے اس وقت بھی ہندوستان کے بارے میں وہاں واقفیت بہت ہی کم تھی۔ اتنی کم کہ آج مضحکہ خیز لگتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''کچھ دن پہلے جب ہندوستان میں شعرا کی تصویر والے ٹکٹ چھپنے کی خبریں اخباروں میں نکلیں تو امریکہ کے سب سے مشہور اخبار نیویارک ٹائمز نے بھی اس خبر کو تفصیل سے چھاپا مگر غالبؔ کا نام بھی غلط لکھا اور اس کو بھی ہندو لکھ دیا۔ کاظم صاحب نے ایڈیٹر کو ایک خط لکھا کہ یہ غلط ہے اس کی تردید کردیجئے۔ وہاں سے بڑی ناخوشی کا جواب آیا کہ آپ کو اعتراض نہیں کرنا چاہئے تھا۔ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ غالبؔ مسلمان تھے۔ خیر انھوں نے کچھ ثبوت جو سمجھ میں آئے لکھ بھیجے مگر ایڈیٹر صاحب نے تردید شائع نہیں کی۔ ہاں کچھ دنوں کے بعد ایک دوسری خبر دیتے ہوئے غالبؔ کا نام صحیح شائع کیا۔'' (۱۱۵)

مگر گذشتہ نصف صدی میں اُردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے واقفیت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ آج ساری دنیا کی طرح امریکہ کے باشندوں میں ایسے اردو اسکالر نکل آتے ہیں جو اردو کے بارے میں علم کو صیقل کرنے کی غرض سے آئے دن ہندوستان میں دکھائی دیتے ہیں۔

۱۹۵۲ء میں اشتراکیت دشمنی امریکہ میں اپنے عروج پر تھی۔ یہ میکارتھی اِزم کا دور تھا جب آئین اسٹائن تک کو شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا۔ دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی روس اور امریکہ کے حلقۂ اثر کے درمیان ہر طرح کی کش مکش ہو رہی تھی۔ روس کا اثر نو آزاد ملکوں میں زیادہ

تھا جن کو امریکہ چھین لینا چاہتا تھا۔ ہندوستان پر بھی روس کا اثر زیادہ تھا۔ احتشام صاحب تو اشتراکی تحریک کے ادبی محاذ کے سب سے اہم رہنماؤں میں تھے۔ پھر وہ امریکہ کیسے پہنچے۔ وہ امریکہ پہنچے ہی نہیں بلکہ بڑے چاؤ۔ سے بلائے گئے اور وہاں اُن کی غیر معمولی آؤ بھگت ہوئی جوان کے ادبی مرتبے کے عین مطابق تھی۔ اس سارے معاملے کا ذکر ''ساحل اور سمندر'' میں بہت دلچسپ ہے۔ احتشام صاحب کو جب مسٹر گل پیٹرک نے امریکہ آنے کا دعوت نامہ دیا تو وہ ششدرر ہ گئے۔ پروفیسر ڈی پی مکھر جی اور دوسرے دوستوں سے مشورہ کیا، پتہ چلا کہ اُن کا نام خود ڈی پی مکھر جی نے ہی تجویز کیا تھا، جو عمرانیات کے ماہر اس وقت نہ صرف لکھنؤ میں بلکہ سارے ہندوستان میں بائیں بازو کے دانشوروں کے سرداروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ مگر احتشام صاحب کی سمجھ میں نہ آیا یہ سب ہوا کیسے۔ آخر وقت تک ان کے اندر ایک کشمکش رہی کہ دعوت نامہ قبول کریں نہ کریں۔ گل پیٹرک ہر قیمت پر اُن کو بلانے پر آمادہ تھے۔ احتشام صاحب کی جھجھک اور پس و پیش سے مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ کوئی گناہ کرنے جارہے تھے۔ اتنے اہم اور جانے مانے اشتراکیت دشمن کے حلقے سے نہ صرف دعوت نامہ بلکہ شدید اصرار! احتشام صاحب کی سچی بے لاگ سرشت اس دعوت نامے کے کسی بھی جواز کو آسانی سے قبول کرنے کے لیے راضی نہیں ہوسکتی تھی۔ جب سب کچھ طے ہوگیا تب بھی ان کے ذہن میں ایک سوال تھا جو امریکہ کے پورے قیام کے دوران قائم رہا۔ آخر اس سفر کا مقصد کیا ہے؟ اگر کسی خاص پروجیکٹ میں کسی علمی ادارے سے دعوت نامہ آیا ہوتا تو بات ان کی سمجھ میں آتی، کہیں سے لکچرز کے لیے بلایا جاتا، یا کسی کتاب کی تیاری کے سلسلے میں جانا ہوتو دل مان لیتا مگر یہ امریکہ جانا، گھومنا، لوگوں سے ملنا اور واپس آجانا، یہ سب کیا تھا۔ احتشام صاحب جیسا انسان جو بین الاقوامی سیاسی صورت حال کا بھی تماشائی تھا، سارا معاملہ سمجھ چکا تھا۔ وہ جان گئے کہ امریکہ نو آزاد ملکوں میں مداخلت کے نئے راستے ڈھونڈ رہا ہے، بااثر دانش وروں سے رابطہ قائم کر کے اپنی قوت کا اندازہ کر رہا ہے اور مخالفوں میں اپنی نیک نیتی کا بھی چرچا کرنا چاہتا ہے۔ آج امریکہ جو کچھ ہے وہ ہم سب پر عیاں ہے مگر اس وقت اس کی مہم کا دورِ آغاز تھا۔ احتشام صاحب کے بارے میں بھی اپنے خفیہ ذرائع سے وہ سب کچھ جانتے ہوں گے۔ احتشام صاحب نے بھی بار بار اپنے نظریے اور وابستگیوں کو عیاں کیا۔ پھر بھی جب ان کا جانا طے ہی ہوگیا تو انھوں نے جال میں نہ پھنسنے کے سارے طریقے اختیار کیے۔

امریکہ کے ویزا کے لیے حلف لینا ضروری تھا کہ وہ کمیونسٹ یا فاشسٹ پارٹی کے رکن نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ باقاعدہ کسی سیاسی پارٹی کے رکن نہیں تھے اس لیے یہ حلف انھوں نے لیا مگر امریکہ پہنچنے کے بعد انھوں نے وہاں کے کمیونسٹ اور بائیں بازو کے دانشوروں سے رابطہ قائم کیا جو اس زمانے میں خطرے سے خالی نہیں تھا۔

ملک سے باہر جانا اور آنا آج کی طرح روزمرہ کا معمول نہیں تھا کہ بقول انشاء حاضری کھائیں جو دتی میں تو لندن میں 'ٹپن' سارے جوار میں چرچے ہوتے۔ ہار پھول، دعوتیں، سپاس نامے، دعائیں، تہنیتیں غرض کہ کیا نہیں ہوتا احتشام صاحب کو بھی اسی شان سے الوداع کہا گیا۔

احتشام صاحب سے آٹھ دس برس پہلے ہمارے جاننے والوں میں ایک صاحب انگلستان چند ماہ کے لیے گئے۔ واپس آئے تو ان کے اعزاز میں بڑا جلسہ کیا گیا۔ ہم چھوٹے تھے۔ ان کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سب لوگ ان کے اردگرد گھومتے رہتے تھے۔ اُن سے کسی نے پوچھا کہ انگلستان میں کیا دیکھا؟ تو بولے، بھائی! وہاں کا تو بچہ بچہ انگریزی بولتا ہے۔

خیر احتشام صاحب ایسے تو نہیں تھے مگر ایک اجنبی دیس میں اعزا اور اقربا کے بغیر گذر کرنا انہیں بہت دشوار لگتا تھا۔ چنانچہ جانے سے پہلے کئی بار انھوں نے اسی بنا پر ارادہ بدلنا چاہا اور امریکہ کے قیام کے دوران کوئی دن ایسا نہ تھا جب ان پر گھر کی یاد کے ساتھ رقّت نہ طاری ہوتی ہو۔ جب امریکہ میں محرم کی پہلی تاریخ کو وہ واقعی روئے تو اس میں عزاداری کے علاوہ لکھنؤ کے محرم کی یاد ضرور شامل رہی ہوگی۔

ہم ہندوستانی جب ملک کے باہر جانے لگتے ہیں تو سب سے زیادہ جلدی ہوتی ہے وہاں کی خواتین کی بے محابا جلوہ گری دیکھنے کی۔ چاہے مانیں یا نہ مانیں۔ ہوائی جہاز میں داخل ہوتے ہی ایرہوسٹس کا مکھڑا نظر آیا کہ دل کی دھڑکنوں کا آہنگ بدل گیا۔ کس پر کیسی زد پڑتی ہے یہ الگ بات ہے۔ احتشام صاحب کا مزاج یہاں بھی متوازن رہتا ہے اگرچہ وہ خود اس توازن کو حد سے زیادہ برقرار رکھنے کے حق میں نہیں لگتے۔ ابتدا میں وہ ایرہوسٹس کے لیے میزبان فضا کی اصطلاح مذکر کے صیغے ساتھ ساتھ استعمال کرتے ہیں مگر پھر دو چار روز بعد صیغہ بدل جاتا ہے، پھر دھیرے دھیرے اُن کی شخصیت کی معصومیت سے غیر ضروری نقاب خود بخود اٹھ جاتے ہیں، امریکہ کی عورتیں انہیں کچھ زیادہ اچھی نہیں لگتیں۔ وہ لکھتے ہیں ''یہاں کی جوان عورتوں کے چہرے، خط و

خال رفتار و گفتار میں وہ دل کشی نہیں ہے جس کی آرزو کی جاتی ہے۔ کبھی بھولے بھٹکے کوئی چہرہ نظر آ جاتا ہے جسے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہو ورنہ عام طور پر نہ تو وہ معصومیت ہے جو متوجہ کرے، نہ چال ہے جس میں شراب کی مستی ہو۔ نہ آنکھوں میں رس ہے جو انسانوں کو مدہوش کر دیتا ہے۔ عورتیں بس عورتیں ہیں شعر و شراب نہیں ہیں، میرا خیال ہے کہ اُن کے چہروں میں جنسی کشش کا زمانہ بہت مختصر ہوتا ہے اور وہی جب جوانی طفلی سے گلے ملتی ہے۔ اُن عمر رسیدہ خواتین کے ہاں نسوانی وقار، لی اور کشش کا احساس ہوتا ہے مگر وہی خالی بوتلیں جن میں شراب دو آتشہ کی امید کی جا سکتی کی مر کیا عجب یہ میری غلط فہمی ہو اور آیندہ میری رائے بدلے۔" امریکہ میں تو ان کی یہ رائے نہیں بدلی مگر لندن میں کیفیت کچھ اور ہی ہے لکھتے ہیں:

"کون کہتا ہے زندگی حسین نہیں ...... یہ انسانی حُسن جامہ زیب جسم، یہ گوشت اور پوست کے اندر تھرکتی ہوئی جوانی' یہ اختلاط اور پیار کے نظارے' یہ جرأت شکن بے اعتنائی' یہ رنگین ہونٹوں کے دل آویز خطوط اور یہ آبشار کی طرح گرتی ہوئی زلفیں، یہ جسم کے اندر نہ سمانے والا شباب (سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا) کون کہتا ہے کہ زندگی حسین نہیں ہے۔"

امریکہ پہنچنے پر وہ محسوس کرتے ہیں کہ "یہ جگہ دیکھنے اور سیر کرنے کی ہے، قیام کی نہیں ہے، یہاں زندگی کی رفتار بہت تیز ہے اور بڑے پیمانے پر کوئی شکل اختیار کر رہی ہے جسے میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ یہاں کی چیزوں کی فراوانی اور دولت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ناممکن ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (الہ دین کے چراغ سے پیدا ہونے والے دیوزادوں نے رات کی تاریکی میں یہ عمارتیں، بھاری بھرکم اور پراسرار عمارتیں کھڑی کردی ہوں گی" (۸۹)

امریکہ کی علمی اور ادبی زندگی کے بارے میں مختصر ذکر جا بجا ملتا ہے، وہاں کی اہم شخصیتوں سے بھی ملاقات ہوئی، مشہور نقاد Triling سے وہ بہت خوش ہوئے۔ گو کہ Triling ۳۹ء کے بعد سوویت یونین کے مخالف ہو گئے تھے۔ احتشام صاحب کو Triling امریکی نقادوں سے خوش نظر نہ آئے۔ ان کا خیال تھا کہ امریکہ میں تنقید کے مختلف اسکول نہیں ہیں بلکہ لوگ شخصیتوں کے گرد اکٹھا ہوتے ہیں اور اپنا اپنا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

"مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ تاریخی تجزیہ' سماجی، سیاسی پس منظر ہر چیز کو نظر انداز کر کے خالص ادبی نقطۂ نظر سے چیزوں کو دیکھنا چاہتے ہیں یا ان باتوں کا تذکرہ کم چاہتے ہیں۔ اس سے

ان کی مصلحت پوری ہوتو ہو انھیں کبھی صحیح حالات کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک طرح کی خود فریبی ہے کہ ہندوستانی ذہن کو نظر انداز کر کے اس کے موجودہ مسائل کو سمجھا جا سکتا ہے لطف یہ ہے کہ اس بات کو بہت صاف صاف کہتے بھی نہیں، خیر میں ایک آدھ چیزیں لکھوں گا اور اس میں ان باتوں کو اس طرح لاؤں گا کہ انھیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہو اور نہ ہو تو مجھے کیا!'' (۱۹۱)

اُن کے امریکہ کے قیام کے دوران اسٹالن کا انتقال ہوا۔ اُن کی زبانی اس واقعہ کو سنیے ۴ر مارچ کو وہ لکھتے ہیں ''صبح کے اخباروں میں اسٹالن کی خطرناک بیماری کی اچانک خبر نے رنجیدہ کر دیا۔ اس خبر سے متعلق یہاں کے اخبارات کی سرخیوں اور اُن کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی شیطانی مسرت کو کبھی نہ بھولوں گا۔ مرنا تو سب ہی کو ہے، افراد مرتے ہیں تاریخ نہیں مرتی'' (۲۰۷) پھر ۶ر مارچ کو اسٹالن کے انتقال کی خبر پا کر لکھا۔ ''ایک بہت بڑا عالم، دانشور، انسان دوست، امن پسند، عوام کا رہنما دنیا سے اٹھ گیا۔ اُس کے علم کی ضیاء اُس کے یقین کی گرمی سے میرے شعور نے کچھ نہ کچھ روشنی اور گرمی حاصل کی یقیناً یہ بڑا نازک وقت ہے...... میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں...... پھر لکھوں گا...... کہیں نہیں گیا، کسی سے نہ ملا صرف بے ارادہ سڑکوں پر گھومتا رہا (۲۶۰)

احتشام صاحب نے امریکہ جانے سے پہلے تلنگانہ کے ایک ریلوے اسٹیشن پر ایک چھوٹے سے لڑکے کو آواز لگا لگا کر اسٹالن کی کتابیں بیچتے دیکھا تھا۔ تب کون جانتا تھا کہ زمانہ کیا رُخ اختیار کرے گا۔

روس کے زوال سے پہلے اسٹالن کا زوال ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اشتراکی نظریات میں تبدیلیاں آتی رہیں۔ روس حاوی تو عرصے تک رہا۔ مگر یورو کمیونزم اور ''نیو لفٹ'' وغیرہ کا ساری دنیا میں چرچا ہوا۔ آج احتشام صاحب کی یہ باتیں بے وقت کی راگنی ضرور لگتی ہیں، مگر یہ ایک عہد کی داستان ہے جو ابھی ختم نہیں ہوئی بلکہ ایسی منزلوں سے گذر رہی ہے جن کا کسی کو پتہ نہ تھا۔ وہاں اشتراکیت کے خلاف عام فضا سے انھیں خاصی وحشت تھی وہ اپنے ہم خیال لوگوں سے ملنا پسند کرتے تھے۔ آرتھر کوسلر۔ اسٹیفن اسپنڈر کی سوانح عمریوں اور لوئی فشر کی کتاب "god that failed" جن کا اُس زمانے میں خاصا چرچا تھا، کمیونسٹ دشمن پروپگنڈے میں حصہ لے رہی تھیں۔ احتشام صاحب ان سب سے نالاں ہیں۔ لوئی فشر کی کتاب کے بارے میں کہتے ہیں:

''یہ سب کے سب لکھنے والے مارکسزم کے فلسفہ اور اصول کو اپنے جذبات کا تابع بنانا

چاہتے ہیں۔ یہ انفرادیت کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔اور انفرادی آزادی کے مفہوم اور حدود پر غور نہیں کرتے، ایک سائے کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ذاتی ناکامیوں، خلش اندوزیوں اور جذباتی نا آسودگیوں کی وجہ سے کمیونزم کی طرف گئے اور جب خود ان کے خیال کے مطابق نتائج نہیں نکلے تو وہ واپس چلے آئے‘‘(۲۱۸)

امریکہ میں انھوں نے ادبی محفلوں، تہذیبی اجتماعوں اور ذاتی ملاقاتوں میں جو کچھ پایا اس نے ان کو مطمئن نہیں کیا۔ ہاں پال رابسن، ہاورڈ واسٹ، پرل بک وغیرہ سے مل کر اُن کو یقیناً تسکین ہوئی کیونکہ سرمایہ داری کے اس جنگل میں بس یہی لوگ تھے جو انھیں امریکہ اور مغرب میں بھی مستقبل کی کچھ اُمید دلاتے تھے۔ چنانچہ امریکہ کے قیام سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوا۔ پھر بھی اب یہاں سے چلتے وقت رہائی کا احساس ہو رہا ہے۔ میں قید میں نہیں تھا۔ پھر قید سے چھوٹنے کا احساس کیوں ہے؟ غالباً یہ اس بات کا ردِّ عمل ہے کہ میں یہاں کی سیاسی رجعت پسندی اور حاکم طبقے کی بدنیتی سے سخت بیزاری محسوس کرتا رہا ہوں۔ کچھ بھی ہو یہاں سے نکل رہا ہوں (۲۱۷)

مگر نظریاتی اختلاف کے باوجود ان میں تعصب یا ہٹ دھرمی نہیں ہے۔ کمیونسٹ اکثر بڑے سخت گیر بلکہ بعض اوقات Sectarian نظر آتے ہیں۔ احتشام صاحب کے ہاں نظریاتی سخت گیری کے باوجود ذہنی طور پر رواداری ہے چنانچہ امریکہ کے بارے میں بھی سب کچھ کہہ چکنے کے بعد وہ آخر میں کہتے ہیں:

’’مجھے امریکہ اندھیرے اُجالے کا ایک عجیب امتزاج نظر آیا بار بار تاریکی کے اندر روشنی دکھائی دی اور بار بار تمدنی ارتقاء کے پیچھے دنیا پر چھا جانے کی خواہش کا بھیانک چہرہ سامنے آیا۔ جنگ کی فضاؤں کے بیچ ایماندار ادیبوں کا امن کا نعرہ بھی سنائی دیا۔اس لیے نہ تو میں مایوس ہوا اور نہ مجھے اس سے نفرت ہوئی۔توریت میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے یہود سے کہا: دیکھو مصریوں سے نفرت نہ کرنا کیونکہ تم اُن کے ملک میں اجنبی اور مسافر رہ چکے ہو۔اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس امریکہ سے کیسے نفرت ہو سکتی ہے جس نے میری حیرت اور علم میں اضافہ کیا‘‘(۳۶۳)

اشتراکیت اور روس میں احتشام صاحب کے بعد بہت کچھ ایسی تبدیلیاں ہو گئیں جو خود اُن کو حیرت میں ڈال دیتیں۔مگر امریکہ کے بارے میں اُن کی رائے آج تک نہ صرف صحیح ہے بلکہ وہ لوگ بھی اب ماننے لگے ہیں جو اُن کی طرح روس کے طرفدار نہیں۔

احتشام صاحب کا لندن کا قیام ان کے لیے زیادہ مفید اور دلچسپ رہا۔ یہاں ان کے بہت سے احباب اور اعزا پہلے سے موجود تھے جنھوں نے ان کی اس تنہائی کو دور کر دیا جو امریکہ میں بار بار ستاتی تھی۔ پھر یہاں کی علمی فضا بھی انھیں زیادہ راس آئی۔ تمدنی اعتبار سے بھی یہاں انھیں زیادہ کچھ دیکھنے کا موقع ملا۔ برٹش میوزیم اور بعد میں پیرس کے مختلف علاقوں کی طرح لودر میوزیم ان کی مستقل دلچسپی کا محور بن گئے۔ ان کے ذریعے انھوں نے عالمی تہذیب کے آثار دیکھے جن کا ذکر صرف کتابوں میں پڑھا تھا۔ ادیبوں نقادوں اور عالموں سے ملاقاتیں کچھ زیادہ ہوئیں۔ لندن کے ذکر میں وہ الجھن، گھٹن اور بے مقصدیت کا احساس نہیں جو امریکہ میں روز حاوی رہتا تھا۔ سیاسی اعتبار سے یہاں اُنھیں زیادہ لبرل ماحول ملا جس سے اُن کا مزاج ہم آہنگ تھا۔ اختلاف اور بحث ومباحثے یہاں بھی ہوتے مگر دم گھٹنے کا احساس نہ ہوتا۔ اس سفر میں اردو کے ادیبوں سے بھی ان کی ملاقاتیں رہیں۔ نیویارک میں ن م راشد اور پطرس تھے اور لندن میں قرۃ العین حیدر اور ان کے علاوہ ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کا بڑا اچھا حلقہ تھا۔

یہاں ملکہ الزبتھ کی تاجپوشی کی دھوم دھام اور ملکہ میری کے جنازے کا کہرام بھی تھا مگر احتشام صاحب کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اُسے مرتے ہوئے نظام کی علامت سمجھ کر قدرے تحقیر کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ پیرس میں ان کا قیام صرف چار دن رہا۔ سب شہروں میں پیرس ہی اُنھیں زیادہ پسند آیا۔ اُن کی نظروں میں یہ تجارت کا نہیں خواب وخیال کا شہر ہے۔

اس سفر نے احتشام صاحب کو علم اور تجربے سے مالا مال کیا اور حیرت کو بھی بڑھایا مگر اس سے اُن کے World View میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے اندازے کے لیے ان کی ۱۹۵۲ کے بعد کی تحریریں دیکھنی ہوں گی۔ سفر نامے کے آخر میں ''سخنہائے گفتنی'' کے عنوان سے چند صفحات پر انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا اور آخر کے دو تین صفحے تو اس لائق ہیں کہ انھیں بار بار پڑھا جائے۔ اس سفر نے انھیں خود اپنے آپ سے ہم کلام ہونے کا موقع فراہم کیا۔

''خیر تو اس طویل اور تنہا سفر میں میں نے اگر کچھ اور نہیں سیکھا تو اتنا ہی سہی کہ میں نے احتشام حسین کو سمجھنے کی کوشش کی۔ کہ میں ہر وقت اس کے ساتھ رہا۔ اس سے مشکل اور نازک سوالات کیے، اُسے چھیڑا اور اُکسایا، اُسے آزمایا اور کسا، اُسے خلوت وجلوت میں دیکھا، عجب

انسان ہے۔ متضاد کیفیتوں کا حامل۔ حقیقتوں سے جدوجہد کا شائق اور خوابوں کے پیچھے مارا مارا پھرنے والا...... سماجی جانور بننے کے لیے کبھی کبھی احمق مجنوں یا محض بچہ بننے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس نے اس راز کو نہیں سمجھا۔ وہ ڈرتا رہا کہ کہیں کوئی ہنس نہ پڑے، کوئی کچھ کہہ نہ دے۔ یہ ایک سمٹی سہمی ہوئی محدود شخصیت کی نشانی ہے۔ جہاز میں جب لوگ دلچسپیوں میں مصروف ہوتے اور وہ پڑھتا یا سمندر کی موجوں کو گنتا رہتا تو میرا جی چاہتا کہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لوں اور کہوں کہ یہ کھیل کود، یہ شراب نوشی، یہ رقص کے ہنگامے یہ قمار بازی یہ محض ہنسی کے لیے ہنسی یہ صرف بات کے لیے بات محض حماقت تو نہیں...... میں نے اس سے کہا بھی کہ یہ سنجیدگی بے محل ہے۔ رقص کھیل کود بات چیت کے بہانے دل ملتے ہیں، جسم ملتے ہیں، تجربہ حاصل ہوتا ہے میں باتیں سنا سنا کر اُسے کبھی کبھی منا بھی لایا۔ لیکن اُس کی اداسی اس کا فلسفیانہ غم اس کے احساس تنہائی کو دور نہ کر سکا۔ میں سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ غالباً اسے خود بھی اس کا علم نہیں ہے"

(۳۶۱۔۳۶۵)

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلے ہیں کرگسوں میں !

بعض لوگوں نے Hypocracy کا ترجمۂ بقراطیت، کیا ہے مگر اس سے کام چلتا نظر نہیں آتا۔ اس انگریزی لفظ میں جو مذمت و ملامت کا پہلو پوشیدہ ہے وہ بقراطیت کا لفظ سن کر فوراً ذہن میں آتا نہیں، اور نہ ہی وہ ہلکی سی تحقیر ظاہر ہوتی ہے جو اصل لفظ میں پوشیدہ ہے۔ ترجمہ اصل لفظ کا مکمل بدل تو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ کسی مکمل تصور کے لئے ایک لفظ تلاش کر لینا اور پھر اس کو اس قدر رائج کر دینا کہ لفظ سنتے ہی وہ مخصوص تصور اپنے تمام پہلوؤں اور ان کی ساری نزاکتوں کے ساتھ سامنے آجائے، بہت دشوار کام ہے۔ پھر ہر لفظ کا اپنا صوتی نظام ہوتا ہے اور خاص آوازوں کے ذریعے کوئی تصور ذہن پر اپنے آپ کو منعکس کرتا ہے۔ ہر خطے میں انسانوں کے ذہن و قلب کو بعض مخصوص آوازیں مخصوص طور پر متاثر کرتی ہیں۔ تاثرات و تصورات کی یہی صوتی صورتیں ایک...... تاسب حاصل کر کے الفاظ کے روپ میں ڈھل جاتی ہیں۔ ایک خاص علاقے کی زبان کے الفاظ الفاظ اپنے اندر وہاں کے لوگوں کی نفسیات کو، ان کے سامع کو، ان کے بولنے کی قوت وصلاحیت کو مجتمع کئے ہوتے ہیں اور ان چیزوں کا ترجمہ نہیں ہو سکتا، انھیں صرف سمجھا اور جانا جا سکتا ہے نانچہ کسی لفظ کا مکمل ترجمہ جو اسی تاثر اور ردعمل کو جنم دے سکے جو اصل لفظ کا تھا ممکن نہیں ۔۔آج اردو یا دوسری ہندوستانی زبانوں میں نہ جانے کتنے ایسے الفاظ مروج ہو گئے ہیں جو نئے دم وفنون یا نئے تجربات و مشاہدات کے ساتھ یہاں آئے ہیں اور پڑھنے لکھے لوگوں نے انھیں اسی طرح قبول کر لیا ہے۔ ان کا ترجمہ یا تو ہوا ہی نہیں یا ہوا اور مقبول نہیں ہو سکا کیونکہ ترجمہ سے ۔ کی تاثیر غائب تھی۔ ایسے الفاظ نہ جانے کتنے ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ادھر پچھلے چند برسوں میں جو الفاظ بہت زیادہ چڑھے ہیں، خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں کی زبانوں پر، ان میں ایک لفظ تو وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فرسٹریشن (Frustration) انٹیلیکچوئل (Intellectual) انٹیگریشن (Integration) وغیرہ کا بڑا چرچا رہنے لگا ہے۔

انٹیلکچوئل کا ترجمہ چاہیں تو دانشور کر لیجئے مگر اس سے بھی کچھ تسکین نہیں ہوتی۔ جدید دور میں ہمارے یہاں Intellectual کی جو روایت مغرب سے آئی ہے اس کے لئے کوئی بھی گڑھا ہوا لفظ کام نہیں دیتا۔ دانشور اور دانشوری کے الفاظ بھی اردو میں حال ہی کی اختراع ہیں۔ اور ان کے عام ہوتے ہوتے خاصہ وقت لگے گا۔ ہوسکتا ہے کہ انھیں تسلیم ہی نہ کیا جائے۔ Integration کے لئے یک جہتی جیسا ناقص لفظ چل گیا ہے مگر خیر اس میں کوئی ہرج نہیں اس لئے کہ Integration کی بات ہی اس وقت نہایت ناقص ہے۔ انگریزی میں اس لفظ کے معنی جو کچھ بھی ہوں۔ ہمارے دیس میں تو اس کا مفہوم یہ ٹھہرا ہے کہ اکثریت کے فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کو رجعت پسند طاقتوں کی رہنمائی میں سب پر نافذ کر دیا جائے۔ جو اس کو مان لے وہ وطن پرست، ہندوستان دوست اور جو نہ مانے وہ قوم کا دشمن، کسی بیرونی ملک کا ایجنٹ وغیرہ وغیرہ ہے۔ اس رویے نے ہی Frustration کو جنم دیا ہے۔ اب اس لفظ کے ترجمے کے چکر میں نہ پڑیئے بس یوں سمجھ لیجئے کہ اس کے معنی، میں اس قسم کی ذہنی وحشت و خلفشار جو وطن دوستی کے اس ظالمانہ تصور کے ردعمل کے طور پر ان حلقوں میں پھیل رہی ہے۔ جو اس کے خلاف لڑنے کی تاب نہیں رکھتے۔ ہر بحرانی دور میں، یا تبدیلیوں کی زد پر آئی ہوئی قوم دانش وروں Intellectuals کا Frustration کے ساتھ گہرا ناطہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک کو ہی لے لیجئے خصوصاً اردو زبان کے دانشوروں کے وہ ارشادات دیکھئے جو وہ اردو زبان کے تحفظ کے سلسلے میں کرتے رہتے ہیں۔

یہ حضرات رسم الخط کو ادھر پھر معرض بحث میں لائے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردو رسم الخط دیوناگری ہونا چاہیے تاکہ وہ دوسری ہندوستانی زبانوں سے زیادہ قریب تر ہو جائے۔ بعض اس سے بھی آگے گزر کر اردو کو بین الاقوامی زبانوں کے دوش بدوش لانے کے لیے رومن رسم الخط کو ترجیح دیتے ہیں اور ساری زبانوں سے قطع نظر یہی بات خاصی فضول سی لگتی ہے کہ چند لوگ اپنی ذاتی پسند و ناپسند کو سارے اردو بولنے والوں پر نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ کسی بھی زبان کے ارتقاء کا مطالعہ کیجئے نہ جانے پڑھے لکھے لوگوں نے اصلاح کی کیسی کیسی تحریکات چلائیں مگر آخر چلی کس کی؟ ان چند دانشوروں کی؟ زبان بولنے اور لکھنے پڑھنے والے عام لوگوں کی؟ زبانیں چھوٹی موٹی ادبی محفلوں، اخباروں، اشتہاروں اور رسالوں کے ذریعے بنتی ہیں۔ اور یہ سب تابع ہیں عام بولنے والوں کی مرضی اور مزاج کے۔ نئے رسم الخط کی بات تو دور کی ہے۔ رائج رسم الخط میں معمولی تبدیلیاں بھی بڑی مشکل سے برداشت کی جاتی ہیں۔ اردو میں ٹائپ کی

ضرورت اور اہمیت سے کب کسی نے انکار کیا، مگر ساری کوششوں کا نتیجہ کیا نکلا؟ انجمن ترقی اردو نے صرف املا کی معمولی تبدیلیاں کرنی چاہی تھیں آج کتنے لوگ ان تبدیلیوں کی پابندی کرتے ہیں؟ زبان کے معاملے میں صرف دانش وروں کی دانش وری اور بلند خیالی ہی کافی نہیں ہے۔

زمینی مسائل کو حل کرنے کے لئے زمین پر اترنا بھی پڑتا ہے۔ رسم الخط کی ساری بحث میں یہ سوال اٹھا ہی نہیں کہ اگر رسم الخط کی تبدیلی کا فیصلہ کر بھی لیا جائے تو اسے نافذ کون کرے گا۔ صدیوں کی روایتوں کے ساتھ سدھی ہوئی نگاہیں کوئی اچانک تبدیلی کیسے قبول کریں گی؟ پھر جن لوگوں کے پاس اتنا بھی پیسہ نہیں کہ ہو کسی کتاب کا ایک ہزار کا ایڈیشن چھاپ کر سال دو سال میں فروخت کر سکیں، وہ اپنے سارے علم اور ادبی ذخیرے کو کسی نئے رسم الخط میں منتقل کرنے کے لئے وسائل کہاں سے لائیں گے؟

اور فرض کر لیجئے کہ یہ فاقوں کی ماری قوم اگر دانش وروں کی خاطر ان اعلیٰ منصوبوں کو قبول بھی کرے تو اس سے نتیجہ کیا نکلے گا؟ کیا دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے سے ہندوستان کی دوسری زبانوں کا سیکھنا، یا رومن اختیار کرنے سے چند بین الاقوامی زبانوں کی تحصیل آسان ہو جائے گی؟ رومن رسم الخط انگریزی، جرمن، فرانسیسی الگ الگ سیکھنی پڑتی ہے۔ یہ ہی نہیں رسم الخط ایک ہونے کے باوجود ایک ہی حرف مختلف زبانوں میں، مختلف آوازوں سے ادا کیا جاتا ہے آپ کتنا ہی رومن رسم الخط مان لیں۔ ہر نئی زبان کے ساتھ اس کا صوتی نظام، اس کی گرامر، اس کا روزمرہ ومحاورہ بالکل نئے سرے سے سیکھنا پڑے گا۔

اکثر تجارتی نقطۂ نظر بھی پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ موجودہ اردو رسم الخط کے مقابلے میں دیوناگری یا رومن طباعت کی آسانیاں زیادہ ہیں۔ طباعت واشاعت کی آسانیاں یقیناً ہر زبان کے لئے اہمیت رکھتی ہیں مگر انھیں ہر زبان کی ضرورت کے مطابق حاصل کیا جا سکتا ہے۔ سارے مشرق وسطیٰ میں یہی رسم الخط رائج ہے۔ اس کے لئے اعلیٰ درجے کے پریس بھی قائم ہو چکے ہیں۔ روزانہ اخبارات بھی اسی رفتار کے ساتھ چھپتے اور بکتے ہیں جس رفتار سے ہمارے یہاں انگریزی اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اگر ان ممالک سے تھوڑا بہت سیکھنے کی کوشش کی جائے تو ان مشکلات کا حل کوئی بہت مشکل کام نہیں مگر بات دراصل صرف اتنی نہیں۔ اگر یہی ہوتا تو یہ مسئلہ نہ جانے کب کا حل ہو چکا ہوتا۔ مسئلہ دراصل یہ رسم الخط کا ہے، ہی نہیں اس کے پیچھے دوسرے اور زیادہ اہم مسائل ہیں۔

نوآبادیاتی نظام کے سایے میں

(لارڈ میکالے کے حوالے سے)

ہندوستان میں برطانوی سامراج کے ارتقا کی تاریخ کے مطالعے سے ہمیں زندگی کے بہت سارے ایسے حقائق کی آگہی ہوتی ہے جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ تاریخ کے جس جبر سے ہمارا ملک اور سماج گزر چکا ہے وہ پردۂ غیب سے نہیں اترا بلکہ زیادہ تر ہماری کوتاہیوں کا خمیازہ اور سامراجی قوتوں کی سوچی سمجھی حکمت عملی کا لازمی نتیجہ ہے۔ چنانچہ تاریخ کی قوتوں کے آگے ہماری مجبوری خود انسانی عمل کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کا عکس ہے۔

قوموں کا یہ عروج یا زوال جب آتا ہے تو وہ لاتعداد جہتوں میں عیاں ہوتا ہے۔ اور اگر کسی زوال آمادہ قوم اور ترقی پذیر قوم کے درمیان تصادم ہو تو دونوں ایک دوسرے کے زوال وعروج کو تیز تر کرنے میں حصہ لیتے ہیں۔ مگر کسی قدیم اور طاقتور وحدت کو مکمل طور پر پسپا کر دینا آسان بھی نہیں ہوتا۔ اور اگر نسلی اور جغرافیائی فاصلے ویسے ہوں جیسے ایشیا اور یوروپ کے درمیان تھے تو یہ تصادم بہت زیادہ پیچیدہ اور ظالمانہ ہوتا ہے اور اس کے اثرات دور تک جاتے ہیں۔

ایشیا اور یورپ کے درمیان ابتدائی رابطہ تاجرانہ اور معاشی ضرورتوں کی بنا پر ہوا۔ سائنسی ترقیات کی بدولت رسل ورسائل کی آسانیوں نے دور دراز کے سفر کو آسان کر دیا۔ معاشی خوشحالی نے تحقیق وجستجو کے ساتھ مہم جوئی (adventrure) کے جذبے کو بھی مہمیز کیا اور تاجروں کے ساتھ وہ لوگ بھی یہاں آنے لگے جن کی دلچسپیاں دوسری جہتوں میں تھیں مثلاً علوم وفنون مذہب وفلسفہ صنعت وحرفت وغیرہ۔ چنانچہ علوم والسنہ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ بھی اچھی تعداد میں آنے لگے اور مسیحی مشنریوں کے قافلے اس دنیا اور اس دنیا کے مفادات کو ہم آہنگ کرنے کی غرض سے جان جوکھم میں ڈال کر دشوار ترین خطوں میں جا کر ڈیرے ڈالنے لگے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں سیاسی معاشی اور تہذیبی رابطوں کے فروغ کی رفتار بہت تیز ہوگئی اور اس کے اثرات بھی ایشیا اور یورپ کی زندگی پر بڑھتے گئے۔

ہندوستان کا رابطہ یورپ اور بالخصوص انگلستان سے ان ہی خطوط پر ہوا۔ برطانیہ کے تاجروں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سیاسی طاقت کی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ ہندوستان کی سرزمین اس کے لیے سازگار بھی ثابت ہوئی کیونکہ یہاں کا اندرونی سیاسی و معاشی ڈھانچہ خود کمزور ہو کر انہیں ریشہ دوانیوں کے لیے سارے امکانات فراہم کر رہا تھا۔ مگر ایک اجنبی خطے اور اجنبی نسل کے باشندوں کو مکمل طور پر قابو میں کر لینا آسان بھی نہیں تھا۔ اس کے لیے لازم تھا کہ اس خطے کی زندگی تاریخ اور مذہب کے ہر پہلو سے واقفیت حاصل کی جائے کیونکہ دونوں کے درمیان ایک بڑی خلیج حائل تھی۔ اس زمانے میں ہندوستان آنے والے انگریزوں نے اپنی تہذیب اور ہماری تہذیب کا تقابل کرتے ہوئے بہت دلچسپ اور معنی خیز بیانات دیئے ہیں مثلاً:

" So very opposite are our nations of good breeding and accomplishments, that in most cases to conceive an Indian gentleman capable of acting, dancing or singing, would be to degrade him to the lowest occupations in society....We uncover the head, they do this to their feet; and these are acknowledged as marks of reciprocal respect among superiors, equals and inferiors."

یہ تہذیبی فاصلہ سیاسی و معاشی مقاصد کی راہ میں حائل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ نوآبادیاتی حکمرانوں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں سرگرم ہونے والے ان کے ہم وطنوں میں یہاں کی تہذیب کو سمجھنے کی ضرورت اور خواہش بڑھنے لگی۔ اسی کی بنا پر یہاں کی زبانوں کو سیکھنے کی طرف توجہ ہوئی کہ زبان کے ذریعے ہی کسی نئی تہذیب کے پٹ دوسروں پر کھل سکتے ہیں۔ ہندوستانی زبانیں ابتدا ہی سے تاجرانہ ضرورت کے پیش نظر تو اہم تھیں ہی پھر سیاسی حکمت عملی کا حصہ بھی بنتی چلی گئیں۔ رعایا کی زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کے بغیر دخل اندازی نہیں کی جا سکتی۔ زبانوں کی تحقیق و تدریس اور اس سلسلے میں ہندوستانی زبانوں سے یورپ کی زبانوں میں ترجمے کا کام انہی مقاصد کے تحت فروغ پانے لگا۔ مستشرقین یا Orientalists کا گروہ تیزی کے ساتھ بڑھنے لگا۔ ان ہی میں ایک اہم نام سر ولیم جونز کا ہے جو اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں بحیثیت جج کے رہا اور جس نے لسانی تحقیق کے سلسلے میں شہرت حاصل کی۔ سنسکرت پر اس نے خاص توجہ دی۔ مگر

ہندوستان نے اس راہ میں بھی کئی قسم کے چیلنج پیش کیے۔ایک ایسا ملک جس کی بنیادی صفت اور تاریخی حقیقت تہذیبی یک رنگی نہیں بلکہ ہمہ آہنگی اور تنوع ہے اس کے باشندوں تک رسائی کی ایسی کون سی تدابیر کی جائیں جو بیک وقت اس وسیع وعریض سرزمین کے ہر حصے میں کارگر ثابت ہوسکیں۔سنسکرت قدیم ہند آریائی زبان تھی جس کی جڑیں یہاں بڑی گہری تھیں عربی اور فارسی دورِ وسطیٰ میں یہاں پھیلیں اور حکمراں طبقے میں اپنائی گئیں۔ یہاں کے تعلیمی نظام میں ان تینوں زبانوں کی کلاسیکی حیثیت تھی۔علم وادب کا سارا خزانہ ان ہی زبانوں میں تھا۔حکمرانوں کے علاوہ اشرافیہ اور تہذیبی گروہوں میں ان زبانوں کی کلیدی اہمیت تھی۔ ان ہی کے ساتھ مختلف خطوں کی اپنی اپنی مقامی زبانیں تھیں جن کے بولنے والوں کی تعداد سنسکرت عربی اور فارسی استعمال کرنے والوں کے مقابلے میں بہت بڑی تھی۔اگر خواص سے رابطے کے لیے کلاسیکی زبانیں مقدم تھیں تو مستقبل میں اپنا اثرورسوخ بڑھ جانے کے لیے عوام سے رابطے کے لیے یہی مقامی زبانیں اہم تھیں۔انگریزی زبان نئے حکمراں طبقے کی زبان تھی اس کے ذریعے یورپ کی طرف دروازے کھلتے تھے اور مقامی باشندوں کو نہ صرف روزگار اور ترقی کے دوسرے امکانات روشن کرنے کے لیے اس کی طرف راغب کیا جاسکتا تھا بلکہ ذہنی وجذباتی طور پر انہیں نوآبادیاتی دام میں مدتوں تک اس کے ذریعے اسیر بھی رکھا جاسکتا تھا۔انگریز حکمرانوں میں ان میں ہی الگ الگ ترجیحات کی بنا پر تین گروہ بن گئے تھے۔ایک سنسکرت فارسی اور عربی کا حامی تھا تو دوسرا مقامی زبانوں کے فروغ کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔اور تیسرا انگریزی کے نفاذ کو بہت اہمیت دیتا تھا۔مقصد ان سب کا صرف ایک تھا یعنی برطانوی اقتدار کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے سب سے کارگر حربے کو اختیار کرنا۔

ان میں ایک مشہور نام ٹامس بے بنگٹن میکالے Thomas Babingtan Macaulay کا ہے وہ برطانوی حکومت کا ممبر بھی رہا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپریم کاؤنسل کے رکن کی حیثیت سے ہندوستان کے معاملات میں دخیل بھی رہا۔اس کے Essay اور History of England کو آج بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ ہندوستان میں اس کا قیام ۱۸۳۴ سے ۱۸۳۸ تک رہا اور اسی زمانے میں اس نے یہ یادداشت مرتب کی جس کی تفصیلات اس کے اندر موجود ہیں۔میکالے ان لوگوں میں تھا جو انگریزی زبان کو ہندوستان پر مکمل طور پر نافذ کرنا لازم سمجھتا تھا۔اس کی یہ یادداشت اسی سلسلے کی ایک اہم دستاویز ہے جس کا ذکر ہماری جدید تاریخ میں بارہا آیا ہے اس اہم تحریر کے یہ

جملے تو برطانوی سامراج کی تہذیبی جارحیت اور ظلم کی علامت کے طور پر دہرائے جاتے ہیں۔

''ہمیں سر دست صرف یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ایک گروہ ایسے تعلیم یافتہ ہندیوں کا تیار کر دیں جو ہمارے اور ہمارے کثیر التعداد رعایا کے درمیان ترجمان کا کام انجام دے سکے۔ یہ نئے تعلیم یافتہ رنگ و خون کے اعتبار سے ہندی لیکن اپنے ذوق اور افکار و اخلاق کے لحاظ سے انگریز ہوں......''

میکالے کے نزدیک سنسکرت اور عربی فارسی میں انگریزی کے مقابلے میں علم و ادب بہت کم مایہ ہے اور جو کچھ ہے وہ توہمات اور جہل کا پشتارہ۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے مغرب سے آئے ہوئے سب ہی لوگ اس خیال کے حامی نہیں تھے۔ سر ولیم جونز، ایچ ایچ ولسن، جان گل کرسٹ، میکس ملر گارساں دتاسی کے نام ان مستشرقین میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں جنہوں نے مشرق کی زبانوں کی اہمیت کا اندازہ کیا اور یورپ والوں کو ان کے چھپے ہوئے علمی و ادبی خزانوں سے آگاہ کیا۔ ایچ ایچ ولسن نے میگھ دوت کا انگریزی میں منظوم ترجمہ فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۱۳ میں شائع کرایا تو لارڈ منٹو نے لکھا تھا:

"In these great and immutable features we recognize in Kalee Das the fellow-kinsman of the great masters of ancient and modern poetry: familiar to us, but with whom we never communicated: we acknowledge genius, taste, and judgment in this work, equalled, no doubt, but not surpassed by the most admired author's whom we are accustomed to read in their own language.

پھر بھی اس میں شک نہیں کہ ان ہی مستشرقین کی علمی جستجو نے ہم وطنوں کے نوآبادیاتی مقاصد کو قوت عطا کرائی تھی۔ یہ ان کی اپنی وطن پرستی کا ہی ایک رخ بھی تھا۔ گو کہ علمی دنیا بھی مجموعی طور پر ان کی کوشش سے فیضان حاصل کر رہی تھی۔

کسی قوم کے مستقبل کی ساخت میں اس کے نظام تعلیم کا بنیادی حصہ ہوتا ہے۔ ہمارے

نوآبادیاتی حکمراں اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ہندوستان کی دولت اگر مدتوں تک اپنے قبضے میں رکھنا ہے تو یہاں کی آنے والی نسلوں کو ذہنی اور جذباتی طور پر کچھ اس طرح ڈھالنا ہوگا کہ وہ غلام تو ہوں مگران کے دل و دماغ سے غلامی کا احساس زیاں جاتا رہے۔ اپنے آقاؤں کی چشم کرم کو دیکھنا ان کی سرشت بن جائے چنانچہ لازم تھا کہ ہندوستانیوں کے دلوں میں ان کی کمتری اور اپنی برتری کا بیج کچھ اس طرح بویا جائے کہ وہ اپنی غلامی پر فخر کریں لیکن مجبوری و لاچاری کو آزادی و ترقی سمجھیں۔ چنانچہ انیسویں صدی کی ابتدا سے انگریزوں نے ایک تعلیمی پالیسی وضع کی جو ان ہی خطوط پر سارے ملک میں پھیلائی گئی۔ اکبر الٰہ آبادی کے نقطۂ نظر کو ان کی انتہا پسندی کے باوجود محض رجعت پسندی کہہ کر آج نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آج جبکہ نوآبادیاتی کلچر کے سارے پہلو کھل کر ہمارے سامنے آچکے ہیں ان کے طنز و مزاج میں صداقت کا پہلو کہیں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

اب جب کہ مغرب کا غرور بہت حد تک ٹوٹ بھی چکا ہے۔ ہم تاریخ کے ان اہم پہلوؤں کو ایک نئی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔ جن توہمات کا شکار صرف مشرق کو سمجھا جاتا تھا۔ آج مغرب بھی ان کی زد میں نظر آتا ہے۔ روحانیت کے نام پر توہم پرستی علم نجوم اور ہاتھ کی لکیروں میں قسمت کو پڑھنا اور مستقبل کو ڈھونڈھنا اب وہاں بھی مقبول ہو چکا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی سرحدوں کی انتہا کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے وہ بھی اس سے منہ چھپانے لگے ہیں۔ وہ وادیاں جو کبھی ہری بھری تھیں آج جب ننگی ہو چکیں تو ماحولیات (Environment) کا خیال آیا اور قدرتی وسائل کے استعمال میں توازن کی خواہش ہونے لگی۔ بجلی اور ایٹم کی جگہ سورج اور ہوائی قوت کے استعمال کا پرچار ہونے لگا۔ پن چکیاں پھر چلنے لگی ہیں۔ مشرقی زبانوں کی کتابوں میں اب جہل نہیں بلکہ علم کے خزانے ملنے لگے ہیں۔ مادی ترقی کی خواہشات جو بالکل بے عنان ہو چکی تھیں اب انسانی اور اخلاقی اقدار کی پناہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ لارڈ میکالے کی اس یادداشت کے بین السطور میں ان کے ہم وطنوں کے غرور و خودستائی پر خود ان ہی کی زبان کے عظیم مصنف جارج برناڈ شاہ کا یہ بیان یادگار ہے:

Every Englishman is born with a certain miraculous power that makes him master of the world. When he wants a thing, he never tells himself that he wants it. He waits patiently until there comes into his mind, no one knows how, a burning

conviction that it is his moral and religious duty to conquer those who have got the thing he wants. then he becomes inrresistible. Like the aristocrat, he does what pleases him and grabs what he covets, like the shopkeeper, he pursues his purpose with the industry and steadfastness that comes from strong religious conviction and deep sense of moral responsibility. He is never at a loss for an effective moral attitude. There is nothiing so bad or so good that you will not find an Englishman doing it, but you will never find an Englishman ,in the wrong. He fights you on patriotic principles; her robs you on business principles; he enslaves you on imperial principles; he supports his King on Loyal principles and cuts off his King's Head on republican principles. His watch word is always duty; and he never forgets that the nation which lets its duty get on the opposite side to its interest is lost."



George Bernard Shaw, quoted in History of the Freedom Movement in India by Tara Chand, Publication Division Government of India 1967, VII, P.37

عالمی فسطائیت کا ایک محاذ۔ فرقہ پرستی

آج دنیا فکر مندی کی جس منزل میں ہے پہلے کبھی نہیں تھی۔ ظلم ہر زمانے میں ہوئے۔ جابر حکومتیں اور ان کے نمائندے ہمیشہ اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہے اور اُن کے خلاف جدو جہد کرنے والے بھی ہمیشہ صف آرار ہے۔ کامیاب بھی ہوئے اور ناکام بھی۔ آج کاروبار تو سب وہی ہے مگر اس نے جو صورتیں اختیار کرلی ہیں وہ پہلے کبھی نہیں دیکھی گئیں۔ ہٹلر جیسے لوگوں کے ظہور میں آنے سے پہلے اُس کا خطرہ نظر آجاتا تھا اور لوگ اپنے بس بھر اُس سے مقابلہ کرنے کے طریقے بھی نکال لیتے تھے۔ خواہ وہ کچھ عرصے کے لیے ناکام ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر اُس طرح کی قوتیں کبھی اپنی حد سے زیادہ پنپ نہیں پاتیں۔ تاریخ کے دامن کا سیاہ داغ بن کر رہ گئیں اور بس۔ آج خطرے کو پہچاننے اور اس سے آگاہ کرنے کی منزل بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ اب ساری دنیا کے عوام ایک بھیانک جنگ کے درمیان جی رہے ہیں۔ ایک ایسی جنگ جو بہت دھیمے دھیمے شروع ہوئی اور پھر ایسی منزل میں پہنچ گئی جب مقابلہ کرنے والی طاقتیں آمنے سامنے ہی نہیں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ اور جن ہتھیاروں سے یہ لڑائی لڑی جارہی ہے وہ پہلے کبھی کسی کے ہاتھ میں نہ دیکھے گئے تھے۔ ایٹم بم تو اب بہت پرانا ہو چکا۔ اس کے علاوہ Mass Destruction کے ہتھیار بھی امریکہ اور ہر ترقی یافتہ ملک میں موجود ہیں اور عراق میں ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے۔ ویت نام سے لے جنوبی امریکہ، افریقہ اور افغانستان تک میں آزمائے بھی جاچکے اور اب کون ہے جو اس دوڑ میں کسی سے پیچھے ہو۔ یہ سب کچھ نہ صرف اب پرانا ہو چکا بلکہ خود اپنا توڑ بن کر بے اثر بھی ہو گیا۔ آج خود انسانی زندگی کے اندر جو تباہی و بربادی کے عناصر مل رہے تھے بلکہ پائے جارہے تھے اب ایک ایسے زہر کی طرح پھیل چکے ہیں جو دھما کے کے ساتھ روز اِدھر اُدھر پھٹتے ہیں جانیں لیتے ہیں، بستیاں اُجاڑتے ہیں، مگر جن کے آگے سب ہر دن پہلے سے زیادہ بے بس نظر آتے ہیں۔

سوچا گیا تھا کہ آزادی آئے گی، سامراج ختم ہوگا تو بہت سی مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔ یہ بھی خیال تھا کہ تعلیم پھیلے گی تو روشن خیالی آئے گی۔ ہم سمجھتے تھے کہ جمہوری دور سیکولر نظام، انسان دشمن طاقتوں کو پسپا کردے گا۔ ذات پات، مذہب، نسل، زبان کے نام پر ایک دوسرے کے خلاف ظلم و جبر ختم ہوگا۔ یہ سب کچھ خواب ہوگیا۔ ہمارا ملک جس منزل پر پہنچا ہے وہاں اب بنیادی قدروں کو ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو تاریخ کے ہزاروں سال پر پھیلے ہوئے سفر میں ہم نے حاصل کی تھیں۔ اس راہ پر گزرنے والے کاروانوں کے نقشِ قدم تک مٹائے جارہے ہیں۔ اور آگے کی منزلوں کو دیکھنے کی بجائے نظریں پیچھے کی طرف موڑنے پر اصرار ہے۔ یہ ایک نئے قسم کی عالمی جنگ ہے جس کا ایک مورچہ ہمارے ملک میں کھولا گیا ہے۔ جمہوری سیکولر نظام کی آزادیوں کا فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف زمین ہموار کرنے میں ایک عالمی سامراج کی بھرپور مدد کے سہارے فرقہ پرست اور جمہوریت دشمن گروہ اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آج یہاں حکومت پر جانے مانے مجرموں کا قبضہ ہے۔ اور ان کے ہاتھ مضبوط کرنے والے بازار کے بھاؤ خریدے اور بیچے جارہے ہیں۔

ہمارے ہاں فرقہ پرستی کے خلاف اس طرح سے صف آرائی ہورہی ہے جس طرح فرقہ پرست اپنے آپ کو متحد کر رہے ہیں۔ مگر یہ لڑائی صرف فرقہ پرستی کے خلاف الگ سے نہیں لڑی جاسکتی۔ فرقہ پرستی بھی ایک طرزِ فکر اور طرزِ زندگی کا ہی حصہ ہے۔ آج کی دنیا میں globalization کے نام پر ہونے والے کاروبار نے یہ بھی صاف کردیا ہے کہ اس طرزِ فکر اور طرزِ زندگی کے تانے بانے دنیا میں کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں اور پھیلتے چلے جارہے ہیں۔ مغرب نے جمہوریت اور انسانی حقوق کی حفاظت کا جو ڈھنڈورا تین سو سال تک پیٹا تھا آج اس کا راز بھی دنیا کے ہر گوشے میں فاش ہورہا ہے۔ ان ہی کی بتائے ہوئے ہتھیار انھیں کے سر پر قہر ڈھا رہے ہیں۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے کا جشن ہو چکا۔ اب اس کا Hangover بھی کمیونزم ہی کی طرح ناقابل برداشت ہورہا ہے۔ دہشت گردوں کو پیدا کرنے والے نظامِ زندگی کے سربراہ آج ان ہی کی دہشت کے آگے تھرّا رہے ہیں اور ساری دنیا کو اس لڑائی میں اپنے ساتھ ڈرا دھمکا کر یا خرید کر ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ ایشا، افریقہ اور جنوبی امریکہ مغرب کے دہشت گردوں کا صدیوں شکار رہے۔ ان کا کروٹ بدلنا بھی آج ان کے لیے دہشت گردی ہے۔

فرقہ پرستی، نسل پرستی سے گلے نہیں مل رہی یہ تو ایک ہی سکّے کے دو پہلو ہیں۔ زندگی کے ایک ہی رویّے کا اظہار ہیں۔ ہم ان سب کی بدولت شاید U.N.O میں بھی مستقل جگہ حاصل کرلیں۔ مگر U.N.O کے دانت ہم نے عراق میں دیکھ لیے۔ اقبالؔ نے لیگ آف نیشنز کے بارے میں کہا تھا کہ کچھ کفن چوروں نے ایک انجمن بنالی ہے تاکہ قبروں کو آپس میں بانٹ لیں۔ اور یہ لڑائی نہ ہو کہ کس قبر سے کون کفن کھسوٹے گا۔

من ازیں بیش نہ دانم کہ کفن دوزدے   چند بہر تقسیم قبور انجمے ساختہ اند

بہر حال ان کے حصّے میں تو وہی قبرستان آئیں گے جو خود ہمارے ملک میں بنتے جارہے ہیں چاہے وہ گجرات میں ہوں یا گودھرا میں یا مزورام اور بوڈولینڈ وغیرہ میں۔ مگر اس ساری کہانی میں ہم اور آپ جو کہانیاں کہتے ہیں اور سنتے ہیں۔ شعر کہتے ہیں اور اس پر سردھنتے ہیں۔ کہاں ہیں؟ ایک زمانہ تھا جب قلم کی طاقت اپنے زمانے میں اتنی محسوس نہیں ہوتی تھی جب وہ چلتا تھا۔ مثلاً غالب، ومیر کے زمانے میں صرف داد ملتی۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے لفظوں نے جو وار کئے اُن کے زخم انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی میں محسوس ہونا شروع ہوئے۔ مگر پھر اس کے بعد قلم کی نوک کے خطرناک ہونے کا احساس حکومتوں کو ڈرانے لگا۔ انگریزوں کے سامراج کے زمانے میں جیل کی سزا کے ساتھ کتابوں اور ادیبوں پر پابندی لگانا وغیرہ عام تھا مگر اس کا نتیجہ الٹا ہی نکلتا تھا۔ اسی زمانے سے ایک طریقہ چلا جو آج بڑی ہنرمندی کے ساتھ استعمال ہورہا ہے اور وہ ہے اہل قلم کو ایک بڑھتے ہوئے اور پھیلتے ہوئے بازار میں لاکھڑا کرنا اور اُن پر بولی لگانا۔ آج ہم جو تماشا دیکھ رہے ہیں اُس پر حیرت اور شرمندگی کے احساس اگر جاگتے بھی ہیں تو انہیں سلادینے کی گولیاں بھی ایجاد ہوچکی ہیں۔ مگر اس کے باوجود اگر دہشت گردی سے بھی زیادہ خطرہ ہے تو اس قبیلے سے۔ حبیب تنویر کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ سب نے دیکھا اس سے پہلے صفدر ہاشمی کا قتل ہوچکا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں جو کچھ بھرا جارہا ہے وہ سب جانتے ہیں۔ یہ ایک ہی سلسلہ ہے۔ کڑی سے کڑی جڑی ہوئی ہے۔ ہمارے ملک کے باہر کتنے ملک ہیں جہاں کے ادیب وشاعر اپنے ملک سے باہر جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ مگر یہی وہ طاقت ہے جس کا وجود نہ صرف آج بلکہ آنے والے زمانے میں بھی ایک ڈھارس دیتا ہے۔ گجرات میں جو کچھ ہوا وہ اگر وہیں تک محدود رہا تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کے خلاف سارے ملک بلکہ ساری دنیا میں لوگ صف آرا

ہوئے اور آج بھی انسانی حقوق اور انصاف کے لیے جس بڑے پیانے پر جدو جہد ہورہی ہے وہ اس بات کی ضمانت ہے کہ وقت اپنے بدلنے والوں کو بھی اپنے آغوش میں لیے ہوتا ہے۔

اس صورت حال کے مطالبات ہمارے سامنے ہیں۔ آج کی دنیا میں میڈیا کو زیادہ تر کتاب اور قلم کی دنیا کے ایک Villain کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کتاب اور قلم والوں کے لیے اس نے بہت سے نئے امکانات کے دروازے بھی کھولے ہیں۔ سینما اور ٹی۔ وی کے بعد لکھا ہوا لفظ، لکھے پڑھے لوگوں تک بھی جس پیانے پر پہنچا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے سامنے کی مثال بھیشم ساہنی کا 'تمس' ہے۔ T.V پر آنے سے پہلے کم لوگوں تک یہ ناول پہنچا تھا مگر ٹی وی پر آکر وہ اتنا بڑا سوالیہ نشان بن گیا کہ اس کا جواب دینا ان لوگوں کے لیے مشکل ہوگیا جو اس کی زد میں تھے۔ ہر نیا زمانہ نئے امکانات کا زمانہ ہوتا ہے اور ان امکانات کو دریافت کرنے اور پہچاننے کا اختیار ادیبوں اور شاعروں سے زیادہ اور کسے ہوسکتا ہے۔ میر نے کہا تھا:

''شاعر ہو مت چپکے رہو، اب چپ میں جانیں جاتی ہیں''

تقسیم سے گجرات تک

مذہبی جذبات کو ابھار کر ان کا استحصال کرنا ہمیشہ بہت آسان رہا ہے کیوں کہ اس کے ذریعے اس دنیا کے بہت سے مفادات تو پورے ہوتے ہیں، ایک یہ بھی خیال رہتا ہے کہ اس دنیا کے بعد جب دوسری دنیا میں جائیں گے تو اس کا اور بھی نفع ہوگا۔ وہ لوگ جو اس مہم کا نشانہ بنتے ہیں۔ انھیں اس ثواب کے وعدے کے ذریعے مبتلا رکھنا ہمارے جیسے ملک میں اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ مذہب کے اس بے روک ٹوک کاروبار نے مذہب کا جو حشر کیا اس کا تو ذکر ہی کیا، سماج میں جو مصیبتیں پیدا کی ہیں ان سے عام لوگوں کا خصوصاً کمزور طبقوں کے لوگوں کا خاص نقصان ہوتا ہے۔ کیوں کہ جب بھی مختلف مذاہب کے مفاد پرستوں کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے تو عوام اس کی زد میں سب سے زیادہ آتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اکثریت کو مقدار اور وسائل کے اعتبار سے جو فوائد قدرتی طور پر حاصل ہیں ان کا استعمال اقلیت کے خلاف بھی کیا جاتا ہے۔ اس سارے معاملے میں کسی فرقے کے سب لوگوں کو ذمے دار قرار دینا مناسب نہیں۔ ہر فرقے میں بس ایک چھوٹا طبقہ اپنی زندگی کا مقصد اسی کو بنالیتا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں اسی طرح کے بنائے ہوئے مسئلوں میں سب سے اہم 'اجودھیا' ہے۔

اب اپنے ملک میں گودھرا اور گجرات کے واقعات کو دیکھیے۔ اس سے پہلے بمبئی، سورت اور دوسرے مقامات کے واقعات کا جائزہ لیجیے، سب کا سلسلہ اجودھیا کے مسئلے سے جا کر ملتا ہے۔

جس طرح جرمنی میں ہٹلر نے وہاں کے سارے مسائل کا آخری حل (Final Solution) یہودیوں کے قتل عام میں نکالا تھا اسی طرح ہمارے سابق وزیراعظم اٹل بہاری باجپئی کا کہنا یہ ہے کہ وہ دنیا میں جہاں کہیں بھی گئے انھیں بتایا گیا کہ وہاں مسلمان مسئلے پیدا کر رہے ہیں۔ باجپئی جی کی اس اطلاع سے حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ 'پریوار' کے وفاداروں کے ذہنوں کی تربیت اس طرح کی نہیں ہوتی کہ جتنا کچھ انہیں بتا دیا گیا ہے اس سے زیادہ حاصل

کر سکیں۔ چنانچہ باجپئی جی سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی کہ انھوں نے بیرونی سفر جو کیے ہیں اور کریں گے ان میں وہ یہ دیکھ سکیں اور جان سکیں کہ مختلف مذہبی گروہوں نے مع مسلمانوں کے، انسانی تہذیب کو کیا کچھ دیا جس کے بل پر نہ صرف وہ آج تک موجود ہیں بلکہ باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔خود ہمارے ملک کی تاریخ ان کو بہت کچھ سکھا سکتی تھی مگر اسے تو ان کا 'پریوار' بدل کر پھر سے لکھنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ ہمارے ہاں جمہوریت پسند اور انسان دوست لوگوں کی تعداد پریوار کے مٹھی بھر لوگوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ جب باجپئی جی پر ہر طرف سے سوالات کی بوچھار ہوئی تو انھوں نے کچھ یوں کہا کہ ان کا مطلب دراصل یہ تھا کہ مسلمان دو قسم کے ہوتے ہیں کچھ اچھے اور کچھ برے۔انھوں نے تو صرف برے مسلمانوں کے بارے میں کہا تھا کہ وہ ہر جگہ ایک مسئلہ ہیں۔ مگر اچھے برے لوگ تو ہر فرقے میں ہوتے ہیں۔ وہ خود کس فہرست میں آئیں گے۔شاید بہت سے لوگ اس کا جو جواب دیں وہ ان کے لیے خوش گوار نہ ہو، مگر یہ سب لوگ تو جعلی کے لوگ (Psuedo Secular) ہیں۔

آخری حل (Final Solution) دنیا میں کہیں بھی بالآخر کامیاب نہیں ہوا بلکہ اس کی ناکام کوشش کے نتیجے میں اور زیادہ مسائل پیدا ہوئے اور ہندوستان کو مدِ نظر رکھ کر سوچیے تو اس طرح کی کوشش کا مطلب صرف ایک فرقے کا خاتمہ نہیں پوری قوم کو خودکشی کی دعوت دینا ہوگا۔ کیوں کہ ہندوستان کی ساخت ازل سے ہی ایک ایسی قوم اور سرزمین کی ہے جس میں مختلف سمتوں سے آنے والے نسلی مذہبی دھارے آکر کچھ اس طرح جذب ہوگئے ہیں کہ ان میں سے سب کی الگ الگ شناخت بھی باقی ہے اور سب کی صفات نے مل کر اس کو اور زیادہ خوبصورت بنا دیا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ہر آن یہاں ہمیں ایک وعظ قومی دھارے (Mainstream) میں شامل ہونے کا دیا جاتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اس کے پرچارکوں کی آنکھوں پر ایسے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں کہ وہ یہ دیکھ ہی نہیں سکتے کہ اس قوم پر سب ہی لوگ اس قومی دھارے پر ہر لمحے بہہ رہے ہیں یہ تو ہمارے خون کے اندر شامل ہے اور رگوں میں دوڑ رہا ہے۔

بدقسمتی ہے تو یہ ہے کہ یہی 'ہندوستانیت' ہے جسے برباد کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔فرقہ وارانہ فسادات نے جمی جمائی آبادی کو اپنے اپنے صوبوں میں ان علاقوں سے بے دخل کر کے ان کو مذہب کی بنیاد پر الگ الگ محلوں اور بستیوں میں بسنے پر مجبور کرنا شروع کر دیا ہے۔ایک فرقے

کے لوگ کسی دوسرے فرقے کی اکثریت والے علاقے میں مکان یا دکان خریدنے یا کرائے پر لینے میں عموماً ناکام رہتے ہیں۔ دورانِ سفر ہی لوگ اپنی مذہبی شناخت کو چھپانے کے لیے اپنے نام تک بدلنے لگے ہیں۔ ہمارے عزیز ترین رسم ورواج جو صدیوں کی ہمسائیگی کی بدولت فروغ پارہے تھے انھیں اب جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ گلی محلے اور گاؤں یا کالونی کا پورا منظر فرقے کی اکثریت سے طے ہوتا ہے نہ کہ مدتوں پروان چڑھنے والی روایات سے۔ 'قومی دھارے' کو نیست ونابود کرنے کا اس سے برا طریقہ کوئی نہیں ہوسکتا اور یہ وہ لوگ ہیں جو ایک کنویں میں رہتے ہیں جہاں سے باہر کچھ نظر نہیں آسکتا۔

پرانی تاریخی یادگاروں کو مٹانے اور اپنے تہذیبی ورثے کی عظمت سے اس ناواقفیت پر بے غیرتی کے ساتھ فخر کرنے کو اب 'تہذیبی قوم پرستی' کا نام دیا جانے لگا ہے۔ پتھر کے زمانے کے لوگ جو جنگلوں، پہاڑوں میں غاروں کی دیواروں اور چٹانوں پر اپنے بنائے ہوئے نشانات اور تصویریں چھوڑ گئے ہیں اپنے تہذیبی سرمائے پر تہذیبی قوم پرستوں سے کہیں زیادہ فخر کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ مگر انھوں نے تو ولی گجراتی کے مزار کا نشان مٹادیا جو ہماری تہذیب کے ان بہترین نمائندوں میں سے تھا جس کی شاعری کے سحر نے بیرون ہند کے اہل مذاق کو اپنے حصار میں لیا۔ اس کا دیوان ۱۸۲۵ء میں پیرس میں فرانسیسی ترجمے اور تعارف کے ساتھ شائع ہوا۔ ''تہذیبی محافظوں' نے آفتابِ موسیقی استاد فیاض خاں کی قبر کے نشان کو مٹانے کی کوشش کی جس کے بغیر بیسویں صدی میں ہندوستانی شاستریہ سنگیت کے منظرنامے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

جب ہم ٹیلی ویژن کی خبروں میں دیکھتے ہیں تو ہنستے ناچتے نوجوانوں کے غول کے غول آگ میں جلتے ہوئے، تڑپتے ہوئے ان لوگوں کا مذاق اڑا رہے ہیں جو ان کا شکار ہوئے پولیس وہیں کھڑی ہوئی تماشا دیکھ رہی ہے تو دیکھنے والوں پر اس کا کیا اثر ہوگا، آپ تصور کرسکتے ہیں۔ قتل وغارت گری اور بہیمت کا یہ جشن گجرات سے پہلے کب دیکھنے میں آتا تھا۔ اور جس عمر کے لوگوں میں یہ زہر گھولا گیا ہے وہ تو اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس کے ہاتھ میں اس ملک کی باگ ڈور آنے والی ہے۔

پھر بھی ہندوستان کو، جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایسی قوموں کا ساتھ کبھی راس نہیں آسکتا جو اس کی جڑوں پر ہی ضرب لگا رہے ہیں۔ اس آزمائش کے وقت بھی تمام فرقوں کے عوام کے زبردست جمہوری احتجاج نے اس غارت گری کو روک دیا۔ بڑے پیمانے پر لاتعداد لوگ فساد زدہ علاقوں

کے لوگوں کی حفاظت اور بازآبادکاری کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ گجراتی اور ہندی کے ادیب وشاعر ولی گجراتی کے مزار کی تعمیر کے لیے تحریک چلارہے ہیں۔ ہندوستان کی روح آج بھی زندہ ہے اور تخریب کاروں کے خلاف لوگوں کو صف آرا کر رہی ہے۔

مگر ایسے ہی موقعوں پر منفی قوتیں کہیں نہ کہیں منہ بھی چھپا لیتی ہیں۔ اور چھپ کر سازشوں کے ذریعے جمہوری نظام کو کھوکھلا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہٹلر اور اس کی ریشہ دوانیوں کی ہیبت ناک داستان کو ابھی دنیا نے بھلایا نہیں ہے۔ جمہوریت کو تہس نہس کرنے کے لیے وہ اس کے عطا کیے ہوئے حقوق اور آزادیوں کا ہی سہارا لیتے ہیں۔ آج ان قوتوں کو چھپنے اور خفیہ طور پر سازش کا موقع دینے کی بجائے ان کو بے نقاب کر کے ان کا سامنا کرنا لازم ہے۔ ہندوستان کی روح آج بھی زندہ ہے اور اس کے خلاف صف آرا ہونا لازم ہے۔